ترکی میں عباسی

قمر علی عباسی



ترکی میں عباسی

قمر علی عباسی

ویلکم بک پورٹ (پرائیوٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار، کراچی

جملہ حقوق بحق محفوظ	نیلوفر عباسی
پبلشر	ویلکم بک پورٹ (پرائیوٹ) لمیٹڈ اردو بازار، کراچی۔
جلد اوّل	۲۰۰۲ء
زیر اہتمام	سید محمد قیصر زیدی (چیئرمین)
تزئین	اصغر زیدی
کمپوزنگ	احمد گرافکس، کراچی
ٹائٹل ڈیزائن	سوفٹ لنک
پرنٹرز	اے۔بی۔سی۔پرنٹرز
قیمت	۲۰۰ روپے

ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار، کراچی
فون: 021-2639581/2633151
فیکس: 021-2638086
E-mail: welbooks@hotmail.com

میرے ہر سفر کی منزل
میرے ہر نفس کی ساتھی
نیلوفر عباسی

راز کی بات

ہم جو بار بار بستی بستی قریہ قریہ چکر لگاتے ہیں۔ برف سے ڈھکے پہاڑوں، پھولوں سے بھری وادیوں، سرخ بجری کے راستوں اور خوبصورت مکانوں سے گزرتے ہیں تو آپ کے لئے۔ ورنہ بغداد کے جادو، لندن کی بارشوں، قاہرہ کی گلی کوچوں اور سنگاپور کی راتوں میں رہ جاتے۔ لیکن آپ کا خیال تھا۔ دیس دیس کی کہانیاں نگر نگر کے قصے، چاند چہرہ ستارہ آنکھوں کی باتیں، آپ تک پہنچانی تھیں۔ آپ سرد موسم، مہاوٹوں کی بارش اور آہستہ قدم گرتی برف کی اداس شام کو آتشدان کے پاس بیٹھ کر بھینی خوشبو والی کافی کی چسکی کے ساتھ جب یہ پڑھیں گے اور اس میں آپ وہ دیکھیں گے جو تصور کیا ہوگا۔ تو ہمارا کام پورا ہوا۔

جب ہم کسی بستی کا سفرنامہ لکھتے ہیں۔ آپ کے ساتھ۔ اس علاقے کے لوگ بھی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں انہوں نے کب اپنے وہ مقام اور چہرے دیکھے ہوں گے جو ہم دکھاتے

ہیں۔

پچھلے دنوں ہم نے برازیل کا سفر کیا اور اس کا نامہ لکھا تو یہ برازیل والوں میں زیادہ مقبول ہوا۔ وہ اپنی تاریخ بھول چکے تھے۔ جغرافیہ سے ناواقف تھے اور سمندروں کے کنارے آبنوسی فضاؤں کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ ایسا اکثر ہوا ہے۔

جہاں ہم جاتے ہیں نئی تاریخ بناتے اور جغرافیہ سنوارتے ہیں۔ ان کے معاشی حالات سدھارتے ہیں۔ ہماری تحریر پڑھ کر سیاح ان شہروں اور بستیوں میں غول کے غول کوچہ و بازار جھانکتے نظر آتے ہیں اس لئے ہر ملک چاہتا ہے ہم انہیں عزت بخش دیں۔

ایک محاورہ ہے۔ "زبان یار من ترکی من ترکی نمی دانم" ہمیں اس کا ذاتی تجربہ کرنا تھا۔ زندگی میں جب رقیب سے بات کی اس نے "ترکی بہ ترکی" جواب دیا۔

ریڈیو پاکستان خضدار (کوئٹہ) میں اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ آر سی ڈی ہائی وے پر اکثر سفر کرتے تھے۔ جسے ترکی، ایران اور پاکستان نے بنایا تھا ہر فرلانگ پر ترکی کو یاد کرتے۔ ہر جھٹکے پر ایران کا خیال آتا۔ امریکہ آئے تو ایک دن یار من ترکی کے لئے جی تڑپ اٹھا اور ترکی کے سفر کا ارادہ کیا۔ احباب نے روکا۔ ہمسایوں نے ٹوکا۔ لیکن یار من ترکی استنبول لے گیا۔ باقی باتیں سفرنامے میں۔

نیویارک ۔8 اپریل 2001ء

قمر علی عباسی

اور سفر جاری ہے

سفرنامہ نگار طبعاً کبھی بھی آسودہ منزل نہیں ہونا چاہتا کہ بار بار ہجرت کے فیصلوں اور ان کی تکمیل سے ہی اس کے جذبہ عمل کو تقویت ملتی ہے۔ ہجر کے صدموں کی لذت اس کے لئے وصال کے سرور سے زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ کہ اس کے تخلیقی وجدان کا یہ تقاضہ ہے۔

اس سفرنامے کا مصنف ایک سچا درویش بابا سفید پوش قمر علی عباسی شوق سفر سے لبریز، خوشگوار لہجے اور اداس روح کے ساتھ ایک ہاتھ میں بصیرت کی چھڑی اور کاندھے پر خلوص کی پوٹلی لئے گھر سے نکلتا ہے اور بستی بستی چہروں میں رشتے اور رشتوں میں چہرے کھوجتا جاتا ہے اور اس لگن میں کبھی اسے بازیابی کی مہک نصیب ہوتی ہے اور کبھی رائیگانی کی کسک اس کا مقدر بنتی ہے۔

اس کشمکش ترک وطلب میں جس موڑ پر قمر علی عباسی کے اعضاء نڈھال ہونے لگتے ہیں

وہاں ڈھلتی شام کا پڑاؤ ڈالتا ہے۔ سردیوں کی دھند کے سائے میں ایک چوپال سجالیتا ہے۔ سامنے رکھے لکڑیوں کے ڈھیر میں انگارے جاگتے اور الاؤ بنتے ہیں۔ بوڑھے بالک گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ شوق سے چھلکی آنکھ اور خاموش لب لئے اور یہ بے نیاز مسافر مسکراتا جاتا ہے اپنی چھڑی کی نوک سے زمیں کریدتا جاتا ہے۔ دل کا لہو ہاتھوں کے کٹورے میں بھرتا جاتا ہے۔ داستان کہتا جاتا ہے۔

اس داستان میں کیا کیا نہیں۔ کبھی ماضی کے حویلی کے دریچے کھلنے لگتے ہیں۔ کبھی مستقبل کے افق پر ستارے نمودار ہوتے ہیں اور کبھی حال کے آنگن میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ کبھی ندیوں کے سینوں پر جھکنے والے بادلوں کی سرمستیاں بکھیرتی ہیں۔ کبھی برف کے نرم سفیدیوں سے ابھرتے خال وخد سانس لیتے ہیں۔ کبھی پانیوں میں ٹھہرے پلوں پر گھٹتے۔ بڑھتے فاصلوں کی کہانیاں وجود میں آتی ہیں۔ کبھی پہاڑوں سے اترتے لہراتے بل کھاتے چشموں سے سنہرے گیت سنائی دیتے ہیں۔ کبھی ہوا کی رقص کرتی سرگوشیاں کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ کبھی پرندوں کے پردوں پر بے قرار اڑانوں کی خوش گمانیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی رزق کی انتھک دوڑ میں مگن انسانوں کی پیشانیوں پر پسینے کے قطروں کی سچائیاں جھلکتی ہیں۔ کبھی مزاروں پر دانہ چگتے کبوتروں کی دعاؤں میں تاثیر کے نقش ابھرتے ہیں۔ کبھی صبح دم مسجدوں میں جاگنے والی اذانوں میں صدائے بلال کا جمال جھلکنے لگتا ہے۔ کبھی مندروں میں جلنے والے لوبان کی بو کائنات کی آرتی اتارتی ہے۔ کبھی وجد آفرین شبدوں میں عشق گل کا سیل لگ جاتا ہے۔ کبھی ملکوں کی غلام گردشوں میں وچھوڑے کی ماری ہوئی روحوں کے نوحے سنائی دیتے ہیں۔ کبھی بچپن کی گلیاں اپنی ماؤں کی چادریں تھامے بچوں کی معصومیت سے بھرجاتی ہیں۔ کبھی گزرتی عمر کی تنگ دامانی کا خوف ذہن ودل کو گھیرے میں لے لیتا ہے۔ کبھی ساون رت کی خبر سناتی باغوں میں لگی امبیاں ذوق طلب کو تیز کرتی ہیں کبھی زردوالوں کے تماشے رومان پرور فضاؤں میں حقائق کا زہر گھولتے ہیں۔ کبھی شہرتوں کی زرد دھول ملول کرتی ہے تو کبھی سرد تنہائی بسروچشم قبول کرتی ہے۔

قمر علی عباسی کا نظریہ فن واضح ہے۔ اس نے کسی طرح کی غیر ضروری مذہبی سماجی وسیاسی حد بندیاں نہیں کیں۔ ذاتی تعصبات کی بنیاد پر ترجیحات کا تعین نہیں کیا۔ بلکہ سادگی۔ اپنائیت اور دیانتداری سے مسافرت کے تجربوں کو بیان کیا ہے۔ انسانی جذبات وحالات کے تجزیے نہیں

کیے۔ فیصلے نہیں کیے۔ تذکرے کیے ہیں۔ کہ بابا سفید پوش کو اس کی تمام جلالی کیفیات کے باوجود بھی اس کا فطری عجز اجازت نہیں دیتا کہ ذات اور کائنات کے بے ساختہ پن کو تار تار کرے۔ اپنی فکری فتوحات کے پرچم بلند کرے...... اسی لئے قمر علی عباسی کی جستجو قائم ہے۔ راستے آباد ہیں... چوپالیں سج رہی ہیں۔ ہوائیں زمین وآسمان کے اسرار ورموز سے آگاہی حاصل کر رہی ہیں۔

وصل کو ہجر کے راستوں پر حیران کرتی زندگی متحرک ہے...... اور سفر جاری ہے...

سان فرانسسکو
(امریکہ)

نوشی گیلانی

فہرست

زبانِ یارِ من ترکی

صبح کے نو بجے تھے۔

دفتروں میں اتوار تھا۔ اس دن بینک میں کسی کا ہونا بڑی بات تھی۔ ایک صاحب ٹیلیفون دو سکوں سے مشین پر کچھ ٹائپ کر رہے تھے۔ اب سی کی تحریریں کالم ترکی طرف انھیں تو ہم نے 50 امریکی ڈالر پیش کیے۔ انہوں نے نوٹ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک نظر ہم پر ڈالی۔ جیسے پوچھ رہے ہوں یہ ہرے ہرے کہاں سے لائے؟ لیکن شاید انھیں اس سوال کی انگریزی نہیں آتی تھی۔ پھر سوچا ایک کاغذ پر ہمارے دستخط لیے مشین کے بٹن دبائے اور دراز سے کچھ نوٹ نکال لے۔ نیویارک کی ٹریول ایجنسی نے احباب تک نے اطلاع دی تھی کہ ترکی میں امریکی ڈالر کی وہ قدر و منزلت ہوتی ہے جو مشرق میں شاعر اپنے محبوب کی کرتا ہے۔ لیکن نوٹ ہاتھ میں آئے تو احساس ہوا شاعر پاگل ہو گیا ہے یا محبوب مفت۔ اب بات کروڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ کبھی نوٹ پر

اتنے زیرو نہیں دیکھے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ بینک کے کلرک نے چھٹی کی نیند میں غلطی کر دی ہے۔ لیکن ترکی لیرا کے ساتھ جو کاغذ ملا۔ اس میں وہی رقم لکھی تھی۔ زندگی بھر ریاست امارت کے خواب دیکھتے رہے۔ افسوس کبھی ارمان پورے نہ ہوئے۔ بہت ہوا تو ہزار کمائے لکھ پتی تک نہ بن سکے آج استنبول کے ہوائی اڈے پر اچانک کروڑ پتی ہو گئے۔ بینک والوں سے کوئی سوال جواب کرتے کہ پیچھے دو مسافر آ کھڑے ہوئے۔ کروڑوں لیرا جیب میں رکھ کر قدم آگے بڑھایا تو اِدھر اُدھر احتیاطاً دیکھ لیا۔ کوئی ہے تو نہیں۔ دو چار دن بعد معلوم ہوا استنبول کا غریب آدمی بھی جیب میں چار چھ کروڑ لیرا رکھے پریشان پھرتا ہے۔ ترکی والوں کو زیرو اور نکتے کا شوق ہے۔ رقم میں بے شمار زیرو اور حروف تہجی میں نکتے لگا دیتے ہیں بعض کے نیچے تو باقاعدہ دُم بھی دیکھی ہے... ہمارے ملک میں اکثر نعرے لگتے ہیں۔ "ساؤ ائیڈر شیر ہے"... اور مخالفین کہتے ہیں۔ "دم لگانے کی دیر ہے" یہاں دم لگانے کے باوجود کوئی حرف شیر نہیں بنتا۔ ہندسوں اور حروف پر نکتوں کی وجہ سے عوام حکومت کے کاموں میں نکتہ چینی نہیں کرتی اور انتظامیہ ورلڈ بینک سے بانسری ادھار لے کر بجاتی رہتی ہے۔

ہم کروڑوں اور لاکھوں لیرا لے کر بینک کے کاؤنٹر سے آئے تو استقبال کو آنے والے نے ہمارا بیگ لیا اور سامنے کوچ کی طرف لے چلا۔ یہ سدھارتھ تھا۔ ترکی میں 99 فیصد مسلمان ہیں۔ اس لئے یہ مسلمان تھا۔ کوچ میں ایک اور صاحب بھی آ گئے چشمہ لگائے چھوٹے قد کے۔ ہم سمجھے چین سے آئے ہیں۔ وہ سان فرانسسکو سے آ رہے تھے اور چینی امریکن تھے...

کوچ ایئرپورٹ کے علاقے سے باہر نکلی تو دیکھا ایک جانب ترکی کے بہت سے جھنڈے لہرا رہے ہیں غالباً سیاحوں کو یہ بات بتانے کے لئے کہ وہ واقعی ترکی آ گئے ہیں اس کے بعد جگہ جگہ ترکی کے اتنے جھنڈے دیکھے کہ پچھلے چند دن تو خواب میں بھی جھنڈے نظر آتے۔"

ہم نے پوچھ لیا۔ "استنبول میں موسم خوشگوار ہے۔"

"جی"۔ سدھارتھ بولا۔

"سنا ہے استنبول کی آبادی بہت زیادہ ہے"......

"جی ہاں"... سدھارتھ نے جواب دیا۔

ایک صاف ستھری سڑک اس کے دونوں طرف عمارتیں۔ ایک طویل پرانی شکستہ دیوار نظر آئی۔

"یہ استنبول شہر کی پرانی دیوار ہوگی ...."

"جی ہاں..." سدھارتھ بولا۔

پھر مسجدوں کے مینار نظر آئے۔ سر اٹھائے... خوبصورت ...

"اس شہر میں مسجدوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔"

"جی ہاں"..... سدھارتھ نے جواب دیا۔

"پرانے مکان، فٹ پاتھ، بازار کا علاقہ، ایک چوراہا، اس پر گھاس اور کوڑا کرکٹ۔ شہر صاف نہیں تھا۔ شاید ان لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع نہیں ہوئی۔ پھر خیال آیا آج اتوار ہے۔ چھٹی کا دن۔ اس لئے خاکروب بھی آرام کر رہے ہوں گے۔

کوچ اوپر جانے لگی اور ایک عمارت کے سامنے رک گئی یہ ہوٹل تھا۔ سدھارتھ نے بیگ اٹھایا۔ کاؤنٹر تک لایا جہاں ایک صاحبزادی سراپا تبسم بنی کھڑی تھیں۔ اس نے ترکی میں کچھ کہا اور ہمیں الوداع کہہ کر چلا گیا۔

خاتون نے ایک چابی نکالی اور بیرے کو اشارہ کیا وہ ہمارا اور سان فرانسسکو والے چینی کا بیگ اٹھا کر لفٹ کی طرف چلا۔ اندر داخل ہو کر چوتھی منزل کا بٹن دبایا۔ ذرا دیر میں لفٹ رکی تو ایک کمرہ کھول کر سامان رکھا اور چلا گیا۔

ہمارے مقدر میں سان فرانسسکو کا چینی لکھا گیا۔ اس نے تعارف کرایا" آپ مجھے ای ڈی کہہ سکتے ہیں......"

"اور آپ"

"عباسی ..."

آسان نام تھے دونوں کو یاد ہو گئے۔

"کیا پروگرام ہے......؟" ای ڈی نے پوچھا۔

"امریکہ فون کرنا ہے.... اپنی خیریت بتانے کو....." ہم نے کہا۔

ٹیلی فون کی تلاش میں کمرہ بند کر کے کاؤنٹر پر آئے۔ فون کے لئے ہم کارڈ زیادہ

مناسب سمجھتے ہیں.....

کاؤنٹر پر صاحبزادی سے پوچھا

''فون کہاں سے ہو سکتا ہے.....؟''

کاجل سے بجی آنکھوں سے ہمیں دیکھتی رہیں پھر کچھ بولیں افسوس وہ ہم نہ سمجھے مسکراتی رہیں۔ ہم جان گئے۔ بی بی کو انگریزی اتنی ہی آتی ہے۔ جتنی ہمیں ترکی سے واقفیت ہے۔ ہمارے ہاتھ کے فون اور کارڈ کے اشارے سے ایک بیرے نے کچھ سمجھایا اور اشارہ کیا جو ہوٹل کے دوسری طرف تھا۔ ہم نے سڑک پار کی وہاں سپر مارکیٹ تھی۔ کاؤنٹر پر رش تھا۔ ہم یوں ہی الماری میں رکھی۔ چیزوں کی قیمت دیکھنے لگے اور فوراً احساس ہوا کہ ایئر پورٹ پر جو کروڑوں لیرا دیئے گئے ہیں وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی لاکھوں لیرا کی خریدوا کر واپس لے لیں گے۔ اگلے دن رمضان تھا۔ لوگ اس طرح شاپنگ کر رہے تھے جیسے سارے ملک میں ہوتا ہے۔ ہم انتظار کرنے لگے کاؤنٹر پر کیشیئر خالی ہو تو فون کارڈ کے بارے میں دریافت کریں لیکن لائن ختم نہیں ہو رہی تھی اس لئے خریداروں میں کھڑے ہو گئے جب کاؤنٹر پر پہنچے ہاتھ کے اشاروں سے سمجھایا۔ اس نے ایک کارڈ نکال کر دیا۔ ہم نے جیب سے نکال کر نوٹ اس کے سامنے رکھ دیئے اور کہا'' جو چاہے اٹھالو.. '' ہاتھ کی انگلیاں اٹھا کر بتایا دو کارڈ چاہئیں۔ اس نے اپنی پسند کے نوٹ لئے اور رسید بھی دی۔ ہماری جو شامت آئی تو پوچھ لیا۔''فون کہاں ہوگا۔؟''

پشت پر ایک خاتون کھڑی تھیں انہیں انگریزی کی سمجھ تھی۔ دکاندار سے اپنی زبان میں کچھ کہا..... اس نے دونوں کارڈ ہاتھ سے لئے اور کسی کو فون کیا..... ہم ڈر گئے۔ نہ جانے پردیس میں کیا ہو..

ایک صاحبزادی تیزی سے آئیں انہوں نے چابی سے کیس بکس کھولا اور کچھ رقم نکالی اور کارڈ کے عوض ہمیں پیش کی۔ جو صاحبزادی اس منظر کی ذمے دار تھیں۔ انہوں نے سمجھایا۔

''یہ کارڈ سیلولر فون کے ہیں۔ دوسرے کارڈ پوسٹ آفس سے ملیں گے.....''

پوسٹ آفس بند تھا۔ موسم اچھا تھا... اس لئے یوں ہی فون کارڈ کے بہانے ذرا آگے بڑھے.... ایک پیزا ہوٹل کھلا تھا ہم نے سوچا یہ شاید انگریزی سمجھ سکتے ہوں گے۔ کاؤنٹر سے پوچھا جواب ملا۔

''سامنے گلی میں سیدھے جا کر الٹے ہاتھ چلے جاؤ.. .وہاں ملے گا.....''

یہ راستہ نیچے کی طرف جاتا تھا۔ ہم اور ای ڈی اتر گئے۔ الٹے ہاتھ گئے۔ وہاں جینس میں دکان تھی۔ ایک اسمارٹ بڑی بی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہماری بات نہیں سمجھیں۔ ہم ان کی بات کیوں سمجھتے۔ اس لئے واپس ہوٹل آ گئے۔ لفٹ کے پاس نوٹس لگا تھا......

''ٹور ڈائرکٹر صاحب 6 بجے ملاقات کریں گے۔''

کاؤنٹر پر وہی کاجل سے بجی آنکھوں والی صاحبزادی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ تو دیکھی جا سکتی تھی لیکن ترکی نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔

ہم اور ای ڈی کمرے میں واپس آ گئے تاکہ ذرا دیر آرام کرلیں۔ شام کو تر و تازہ ہو کر ٹور ڈائرکٹر سے فون کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

شام چھ بجے نیچے آئے تو ٹور ڈائرکٹر کی میٹنگ کا وقت سات بجے ہو گیا تھا اور صاحبزادی کی جگہ ایک اسمارٹ نوجوان کھڑا نظر آیا۔

''فون کر سکتے ہیں. ....'' ہم نے پوچھا

وہ بھی کچی انگریزی بولتا تھا...... ''ضرور'' اس نے جواب دیا۔

''نیویارک کے کیا چارجز ہیں......''

''معلوم نہیں......''

''تو معلوم کرو''......ہم نے کہا

''آج اتوار ہے پوسٹ آفس بند ہے.....کل پوچھیں گے. . ..'' وہ بولا۔

''اگر آج فون کرنا ہو تو.. ..''

''سامنے کاؤنٹر سے کرلیں.. ..''

''کس حساب سے چارج کریں گے.....'' ہم نے پوچھا۔

''کمپیوٹر بتائے گا.....'' اس نے کہا۔

''کچھ اندازہ''

''جی نہیں......''

''آپ فون کرلیں جو کمپیوٹر کہے گا ادا کر دیجئے گا......''

ہم نے جی کڑا کر کے نیو یارک کا نمبر ملایا اور گھڑی میں وقت دیکھتے رہے۔ اپنی خیریت بتا کر ڈیڑھ منٹ میں فون بند کیا اور پوچھا "کتنی رقم..."

نوجوان نے کمپیوٹر سے ایک کاغذ نکالا اور ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم نے زیرو گن کر دیکھے... پورے 30 لاکھ لیرا۔

زندگی میں ہم نے اس سے زیادہ قیمتی فون کبھی نہیں کیا۔ ہمارے ملک میں ایک جملہ اکثر بولا جاتا ہے۔ آپ کے لفظ سونے میں تولنے کے قابل ہیں۔" اور کسی نے تولے ہوں یا نہ تولے ہوں۔ ہم نے اس شام اپنے اہل خانہ کے لفظ قیمتی ہیروں میں تولے ہیں۔ وہ اس بات کا خیال رکھیں۔ کاؤنٹر کے سامنے صوفے رکھے تھے۔ یہاں ترکی کے ٹور میں حصہ لینے والے جمع ہونے لگے۔ تعارف ہونے لگا یہ لوگ آنے والے دن رات دکھ سکھ کے ساتھی ہوں گے.....

استنبول میں ہم ٹس لک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ترکی میں ہوٹل "اوٹل" کہلاتا ہے۔ ظالم او سے پہلے لفظ ہٹا دیتے ہیں۔ ٹس لک والوں کا دعویٰ ہے کہ یہ شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ دفاتر، شاپنگ سینٹر اور لطف اندوز ہونے کے مقامات نزدیک ہیں۔

ہم سفر کے دوران ہوٹل کی انتظامیہ کے ہمیشہ ممنون رہے ہیں۔ وہ طعام و قیام کو باعث آرام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان کی استقبالی خواتین مسکراتی، بیرے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اہل خانہ کو فون کرنا چاہو فوراً ملا دیتے ہیں۔ چائے کافی کا آرڈر دو فوراً مہیا کر دیتے ہیں۔ اطمینان دلانے کے لئے سو جتن کرتے ہیں۔ ٹس لک ہوٹل اور ترکی میں "اوٹل" والے خوش اخلاق ملنسار اور خدمت گزار تھے۔ اب اگر کاؤنٹر کی کاجل سے بھری آنکھوں والی خاتون اپنی زبان کا رس ہمارے کانوں میں گھولنے سے قاصر تھیں تو اُس میں بھی ہماری غلطی تھی۔ ترکی سے ناواقفیت۔

اوٹل میں 75 کمرے تھے۔ ہمارے علاوہ بھی دیگر معززین قیام و طعام کرتے تھے۔ 6 سویٹ تھے... ایک دو رات قیام اور زندگی ایک سفر ہے کی وجہ سے اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اوٹل میں بار، ریسٹورنٹ ہر کمرے میں فون، ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر اور ریفریجریٹر کا بندوبست تھا۔ افسوس یہ رہا کہ ٹس لک میں قیام ایک رات تھا۔ کس سہولت سے لطف اندوز ہوتے، فائدہ اٹھاتے۔ افسوس ان سب کو مایوس کیا ...

اوٹل میں ڈرائی کلیننگ کا اعلیٰ انتظام تھا۔ لانڈری، بیگ الماری میں رکھا تھا اپنے استعمال شدہ کپڑے اس میں ڈالیں اور صاف ستھرے خوشبو میں بسے استری شدہ حاصل کریں۔ ایک بار تو جی چاہا اس سہولت سے فائدہ اٹھالیں لیکن جب اُجرت کی فہرست پر نظر پڑی تو سوچا اپنے استعمال شدہ لباس کسی نازک اندام کے ہاتھوں سے استری کرائیں۔ مناسب نہیں۔ قیمتیں یوں تھیں:

قمیض کی دھلائی	24 لاکھ لیرا
قمیض پر استری	12 لاکھ لیرا یعنی استری شدہ قمیض 36 لاکھ
پتلون کی دھلائی	43 لاکھ لیرا
رومال کی دھلائی	4 لاکھ لیرا

لانڈری بیگ خالی رہا... اور امید ہے ہمارے بعد اس کمرے میں آنے والوں نے ہماری روایات کو برقرار رکھا ہوگا۔

سات بجے ایک اسمارٹ نوجوان تشریف لائے۔

میٹنگ شروع ہوئی۔ پہلے لال رنگ کا شربت پلایا گیا۔ ہم شراب سمجھ کر دور رہے۔ بعد میں معلوم ہوا۔ استنبول میں شراب پی جاتی ہے لیکن ہم جیسے عارضی مہمانوں کو پیش نہیں کی جاتی۔ شراب کے شبہے میں شربت سے محروم رہے۔ ٹور گائیڈ کا نام مراد تھا۔ جب یہ انگریزی میں لکھا جاتا تو آخر میں ڈی کے بجائے ٹی ہوتا یعنی مرات۔ خیر یہ ان کا اپنا معاملہ تھا۔ وہ پورے سفر کے دوران مراد ہی پکارے گئے۔ ان کی تقریر میں ترکی کی تعریف، ترک قوم کی ذہانت اور ہمارے لئے اہم بات یہ تھی کہ خبردار جو کسی نے نل سے پانی پیا۔ منہ میں کلی بھری، ہمیشہ منرل واٹر استعمال کریں۔ ترکی میں ماشاء اللہ 15 دریا ہیں جن میں دجلہ اور فرات بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں تاریخی دریا عراق جاتے ہیں اور ہم نے ان کا پانی عرصے تک پیا۔ کچھ نہ ہوا۔ ترکی میں میٹھے پانی کی جھیلیں بھی کم نہیں۔ پھر چار سمندر ہیں۔ اوپر سے برف اور بارشیں خود مقامی لوگ غٹاغٹ نلوں سے پانی پیتے ہیں۔ مراد کا خیال ہوگا۔ ہم لوگ بہت زیادہ پانی پی گئے تو کہیں کم نہ ہو جائے۔ بہر حال کروڑوں لیرا حاصل کئے تھے وہ خرچ کرنے تھے۔ ایک پانی کی بوتل ڈھائی لاکھ لیرا کی آتی ہے۔ ایک سیاح نے دو بوتلیں خرچ کیں تو پانچ لاکھ تو خرچ ہوئے۔

اس میٹنگ میں برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا اور کینیڈا سے 26 سیاح شامل تھے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، جوان سب نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ ہمیں کئی سیاح پسند آئے۔ ان سے گفتگو رہی۔

ئس لک کے نچلے حصے میں ایک ریسٹورنٹ تھا۔ باہر بارش اندھیرا، انجان علاقہ اونچی نیچی سڑک، ہم نے فیصلہ کیا رات کا کھانا یہاں کھائیں گے۔ ریسٹورنٹ صاف ستھرا۔ بیرے مؤدب اور اہم بات یہ کہ انگریزی سمجھتے تھے۔ ہمارے کئی ساتھی اسی جگہ آ گئے۔ ہم نے ایک میز کے گرد کرسی پر بیٹھ کر بیرے سے پوچھا..... ''کھانے میں مچھلی ہے..''

''نہیں سر.....''

''پھر کیا ہے.....''

''شیش، کباب مل جائیں گے.....''

''ہم خوش ہوگئے۔ ایک بار اُردن میں کھائے تھے۔

''ایک پلیٹ میں کتنے کباب ہوں گے.....'' ہم نے پوچھا۔

''چھ عدد.....'' اس نے بتایا۔

ہم نے کہا ''لے آؤ'' بیرا فوراً منرل واٹر کی بوتل لے آیا۔ میز پر ڈبل روٹی کے ٹکڑے رکھے تھے ہم خوش ہو رہے تھے وطن سے اتنی دور کباب کھانے کو ملیں گے۔ بیرے نے اتنی دیر کی کہ ہم میز پر رکھی ساری ڈبل روٹی کھا گئے۔ بیرا پلیٹ میں ایک سیخ رکھ کر لایا۔ اس میں ٹماٹر ہری مرچیں اور گوش کی پانچ چھ بوٹیاں تھیں۔ ہم نے بیرے کی مستعدی کی داد دی یہ اب باقی گرم گرم لائے گا۔ دو بوٹیاں کھا کر ہم نے پوچھا

''باقی کباب کب لاؤ گے.....''

''وہ مؤدب ہو کر بولا۔''

''یہیں ہیں.....''

''مطلب'' ..... ہم حیران ہوئے۔

''اس میں چھ شیش کباب ہیں.....''

''ہم جو بوٹیاں دیکھ رہے تھے۔ وہ چار باقی تھیں۔ دو کھا چکے تھے۔'' یہ کل کباب تھے''

ایک جھٹکا لگا۔ یہ تو ناکافی ہیں..... اب کیا ہوتا۔ ہم نے کہا۔

''کیچ اپ لادو۔''

وہ آیا تو ہم نے زندگی میں پہلی بار سیخ میں پروئے اور جلے بھنے ٹماٹر اور ہری مرچ کھائیں۔ ڈبل روٹی پر زور رہا۔

''چائے۔ کافی.....'' بیرے نے پوچھا۔ ترکی میں چائے کو چائے کہتے ہیں۔

''اچھی سی چائے پلواؤ.....''

چائے آ گئی، اچھی تھی اس کے بعد بل آیا۔ شیش کباب 33 لاکھ۔ پانی 4 لاکھ 50 ہزار۔ چائے 8 لاکھ 50 ہزار ہمیں ان قیمتوں پر اس لئے تعجب نہیں ہوا کہ ہوائی اڈے پر کروڑوں لیرا اس مقصد کے لئے ملے تھے اور آنے والے دنوں میں جب بھی کھانا نوش کریں گے لاکھوں سے کم کیا ہوگا۔ اور زبان شاید اشاروں کی۔ اس لئے بہت پہلے ہمارے بزرگوں نے کہا تھا زبان یارمن ترکی ومن ترکی نمی دانم۔

....

یورپ سے ایشیا

رات کسی وقت بارش ہوئی تھی۔ موسم سرد تھا ناشتے کے بعد کوچ میں سوار ہوئے ہم اگلی سیٹ پر بیٹھے۔ ای ڈی دیر تک نہیں آیا۔ اچانک ایک خاتون آ گئیں۔

''کیا میں آپ کے برابر بیٹھ سکتی ہوں۔'' وہ بولیں۔

''جی ضرور۔ خوشی سے۔ ...''

انہوں نے اپنا بیگ اوپر ریک میں رکھا اور بیٹھ گئیں۔ پھر مسکرائیں۔

''میرا نام کلے ہے میں آسٹریلیا کی رہنے والی ہوں۔'' انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''ہم عباسی ہیں ... پاکستان سے آئے ہیں .....''

''آپ کے نام کے آگے امریکہ لکھا ہے...... انہوں نے کہا۔

''عارضی گھر نیویارک میں ہے......''

انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک پیکٹ نکالا۔ اسے کھولا ایک چاکلیٹ ہماری طرف بڑھایا۔

''لیجئے ....'' انہوں نے دوستی آگے بڑھائی۔

''شکریہ......'' ہم نے دوستی قبول کر لی۔

''یہ آسٹریلیا کی ہے۔ وہاں بہت پسند کی جاتی ہے ...''

''معاف کیجئے گا ہم پاکستان سے کوئی چیز نہیں لائے ورنہ......''

''کوئی بات نہیں۔ اگلی بار لیتے آئیے گا''...... وہ ہنسنے لگی۔ ''آپ نیو یارک میں کیا کرتے ہیں.....؟''

''لکھنا لکھانا۔ سیر و سیاحت''...... ہم نے بتایا۔

''میں پڑھتی ہوں اور ملک ملک جانے کا شوق ہے۔ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتی ہوں۔'' مراد کوچ میں داخل ہوا اور ایک نعرہ لگایا۔

''گونائیڈن'' ترکی میں صبح بخیر کے لئے یہی لفظ کہا جاتا ہے۔ ویسے بعض لوگ مرحبا بھی کہتے ہیں۔ شاید وہ جو ابھی موڈرن ترکی کے عادی نہیں ہوئے۔

مراد نے سیاحوں کی گنتی کی اور ہدایات جاری کرنے لگا۔

''آنے والے دنوں کے لئے یہ آپ کا گھر ہے۔ اسے صاف ستھرا رکھئے...... میرے ساتھ ڈرائیور کا نام باکی ہے۔ ترکی میں آج سے رمضان شروع ہو گیا ہے۔ ..... اور باکی روزے سے ہے آپ پسند نہیں کریں گے کہ یہ بغیر کھائے پیئے کوچ صاف کرے......''

ساڑھے سات بجے کوچ روانہ ہو گئی۔

مراد کہہ رہا تھا۔ ''ایک خاص بات یہ ہے کہ کوچ میں ناخن کاٹنا بدشگونی ہے۔ ہمارے ملک میں یہ نحوست کی نشانی ہے۔ ہم لوگ گھر میں بھی ناخن کمروں یا چھت کے نیچے نہیں کاٹتے۔ کھلے آسمان کے نیچے کاٹنا چاہیے ہم مسلمان ہیں لیکن بعض چیزوں میں وہم کرتے ہیں۔ کوچ میں ناخن کاٹنے اور حادثہ ہو گیا تو ......''

ہم نے دیکھا تو خواتین زیادہ سہم گئی تھیں۔ یہاں تک کہ ہمارے ساتھ بیٹھی کلے بھی خوفزدہ لگتی تھی۔ مراد نے ابتدا ہی ڈرانے سے کی تھی۔ حالانکہ اس کو صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ

ناخن اگر کوچ میں کاٹے گئے تو اس کے فرش پر چپک جائیں گے اور صاف کرنے میں پریشانی ہوگی۔

کوچ استنبول کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ یہ شہر پہاڑی علاقے پر آباد ہے راستے اونچے نیچے ہیں۔ زندگی رواں دواں تھی۔ دکانیں کھلی تھیں۔ لوگ روزمرہ کے کاموں کے لئے گھروں سے نکل آئے تھے۔

استنبول ایک پرانا شہر ہے 3500 قبل مسیح میں آباد ہوا۔ یہاں یونانی آئے۔ رومن کا قبضہ رہا۔ پھر یہ دولت عثمانیہ کے جھنڈے تلے رہا۔ اس کا نام قسطنطنیہ تھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ ''تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کرلوگے اور فوج بھی خوب ہے۔ اس کا امیر بھی خوب ہے۔'' آپؐ نے فرمایا۔'' میری امت کی پہلی فوج قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے ان کو بخش دیا ہے۔''

حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ کے زمانے میں فوج نے قسطنطنیہ کا محاصرہ 34ھ میں کیا حضرت عمر بن عبدالعزیز اور خلیفہ ہشام نے 121ھ میں فوجیں بھیجیں۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں حملہ کیا۔ اسی زمانے میں دوبارہ 168ھ میں قسطنطنیہ کے لئے فوج نے محاصرہ کیا۔ عثمانی خلیفہ بایزید نے دوبارہ حملہ کیا۔ سلطان مراد ثانی نے حملہ کیا اور قسطنطنیہ کے شہنشاہ کی اطاعت اور اظہار ندامت سے واپس آ گیا اور آخرکار دولت عثمانیہ کے ساتویں خلیفہ سلطان محمد ثانی نے 1453 میں قسطنطنیہ فتح کرلیا۔ 29 مئی کو یہ کارنامہ انجام پایا اور اسی دن سے اس شہر نے استنبول کا نام پایا اور دولت عثمانیہ کا دارالحکومت کا تاج اس وقت تک پہنے رہا جب تک ترکوں کے باپ انور کمال پاشا نے اس کے سر سے تاج اتار کر انقرہ میں جمہوریت کا جھنڈا لہرا دیا۔

استنبول کے دو حصے ہیں۔ ایک یورپ اور دوسرا ایشیا میں۔ ان دونوں کو ایک طویل پل ملاتا ہے۔ درمیان میں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ ترکی کا باقی حصہ ایشیا میں ہے۔ استنبول کی آبادی ایک کروڑ 30 لاکھ ہے...... اور یہ بڑھتی جاتی ہے۔ دیہاتوں کے لوگ روزگار اور کاروبار کے لئے یہاں منتقل ہورہے ہیں نئی سڑکیں۔ بستیاں بسائی جاری ہیں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھ پر لوگوں کا سیل دکھائی دیتا ہے۔

جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ گھاس سوکھی ہے..... کوچ کے دائیں بائیں

قبرستان آجاتے ہیں۔ ہر طرف مسجد کے مینار سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ مسجدوں کا شہر ہے۔ یہاں مسلمان رہتے ہیں۔ ان مسجدوں سے پانچوں وقت با آواز بلند اللہ کی بڑائی اور کبریائی کا اعلان ہوتا ہے۔ جو سچ ہے۔ حق ہے 99 فیصد لوگ مسلمان ہیں۔ لیکن حکومت لامذہب ہے۔

آسمان پر بادل تھے۔ ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ استنبول بھیگنے لگا۔ مراد ترکی کی تاریخ کے صفحے الٹنے لگا۔ ترکوں کی عظمت کی داستان سنانے لگا۔ اپنا رشتہ منگولوں سے جوڑنے لگا۔

ہماری منزل چناکلی تھی۔ جنگ عظیم اول کا وہ میدان جہاں 50 ہزار محنت منت کڑیل جوان مار دیئے گئے تھے اس لئے کہ ترکی پر اتحادی ناجائز قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ روس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھری تھی۔

کوچ شہر سے باہر نکل آئی......

ہم نیشنل ہائی وے پر جارہے تھے۔ دونوں طرف بے شمار اپارٹمنٹ نظر آنے لگے یہ تعمیر ہورہے تھے یا تکمیل کے آخری مراحل میں تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو بالکل تیار تھے۔

مراد نے بتایا ''ترکی میں سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار اپارٹمنٹ میں سرمایہ کاری کا ہے۔ بینک اور دوسرے ادارے اس میں رقم لگاتے ہیں۔ جب تک اپارٹمنٹ میں بجلی اور پانی کا کنکشن نہیں لیا جائے۔ حکومت کا ٹیکس واجب نہیں ہوتا۔ اس لئے فروخت کے بعد ضروریات زندگی مہیا کی جاتی ہیں۔ یہ اپارٹمنٹ بہت مہنگے ہیں اور زیادہ تر امریکی ڈالر میں فروخت ہوتے ہیں ترکی میں افراط زر کی شرح 75 فیصد تھی۔ مراد کا کہنا تھا اس میں ہر روز اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارے جانے سے اس میں تیزی آئی ہوگی۔ امریکی ڈالر جو مارکیٹ میں خرچ کیا۔ ترکی کا بیشتر سرمایہ اس قسم کے اول فول کاموں میں لگا ہوا ہے۔

ہم کیلی پولیس کے علاقے میں پہنچے۔ سمندر کے کنارے یہ ایک خوبصورت شہر ہے۔ بڑا چوراہا، سامنے ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ دوپہر کے کھانے کے لئے کیفیز یا بلیدیہ ریسٹورنٹ۔ مراد نے بتایا سامنے پوسٹ آفس ہے۔ جہاں سے فون کارڈز لیا جاسکتا ہے۔ ہم نے یہ سنا تو اس طرف لپک لئے۔

میدان پار کر کے پہنچے تو وہاں ایک گول کمرہ تھا۔ اس میں خاتون بیٹھی تھیں۔ ہم نے

انگریزی اور کچھ اشاروں سے بات سمجھائی۔ موصوف نے مسکرا کر فون کی طرف اشارہ کیا ہم نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور فون میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اب وہ سمجھیں اور ایک کارڈ تھمایا۔ ہم نے لاکھ پوچھا۔ ''اس سے امریکہ بات کر سکتے ہیں۔'' یہ وہ نہیں سمجھیں۔ ہم نے کئی نوٹ ان کے سامنے کیے۔ خاتون نے پسند کے اٹھالئے۔ برابر میں فون لگے تھے۔ ایک سے نیویارک ملایا وہ فوراً مل گیا۔ امریکہ کے حالات معلوم کئے۔ اطمینان ہوا اور ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں مچھلی تھی ہم نے سمندر کی آواز سنی جو ہوٹل کی پشت سے ٹکرا رہا تھا اور مچھلی کھانے کی خواہش کی جب وہ پک کر آئی دکھ ہوا خواہ مخواہ اسے آگ میں پکنے کی زحمت دی۔ وہ تو ہفتوں سے خود ہی اندر اندر پک گئی تھی۔ لیکن ہم نے سنا تھا ''زری خرم'' انسان اپنا زر کھاتا تھا.... وہی کیا اس کا بل 20 لاکھ 50 ہزار لیرا تھا۔ اس کے بعد جس کسی ساتھی نے پوچھا۔ کیسی تھی؟ تو نظر میں رقم رہی اور صرف ایک ہی جملہ کہا ''اچھی۔ بہت اچھی۔ ....''

ہوٹل سے باہر نکلے تو اخروٹ کے برابر نارنگیاں بک رہی تھی۔ وہ بھی ایک گدھا گاڑی پر۔ اچھا لگا دو عدد خرید لیں۔ پھر ایک ٹھیلے پر چنے بک رہے تھے وہ بھی کئی لاکھ لیرا کے عوض مٹھی بھر لے لئے خیال آیا پوسٹ آفس سے ایک فون کارڈ اور خرید لیں یہ سوچ کر میدان پار کیا تو دیکھا وہ گول کمرہ بند ہے اور خاتون کہیں نہیں ہیں۔ شاید اس دن کے کارڈ فروخت کرنے کا کوٹہ پورا ہوا۔ اب کوچ کی روانگی کا وقت ہو گیا۔ بارش اور خنک ہوا سے بچ کر کوچ میں آئے تو اچھا لگا۔

ہم اس علاقے کی طرف روانہ ہوئے جہاں 1915ء میں پہلی جنگ عظیم لڑی گئی تھی یہاں 9 ماہ میں 50 ہزار جوان سپاہی مار دیئے گئے تھے۔ یہ بڑا طویل علاقہ ہے۔

یہ نیشنل پارک ہے۔ اس جگہ کوئی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ یہ پابندی نہ ہوتی تو بھی قبرستان میں کون مکانات بناتا۔ کوچ کے بائیں طرف ساتھ ساتھ سمندر تھا۔ ایک جگہ کوچ روک دی گئی۔ سامنے ایک بہت بڑا پتھر لگا تھا برابر میں گھاس کا میدان اس میں قبروں کے پتھر نظر آرہے تھے۔ جو ڈھلان کی طرف جا رہے تھے۔ نیچے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سردی بھی تھی۔ مراد نے کہا۔ ''آپ لوگ نیچے جا کر تصویر بنا سکتے ہیں۔''

سیاح تو اسی انتظار میں ہوتے ہیں۔ دروازہ کھلا اور سب نیچے اتر گئے۔ ہم اکیلے کوچ

میں کیا کرتے۔ مجبوراً بارش میں باہر نکلے۔ پھر ہمسائی بھی کیمرہ سنبھال کر چلی گئی تھی۔

''یہاں ہندوستانیوں کی قبریں بھی ہیں '' مراد نے بتایا۔

سامنے جو بہت بڑا پتھر دیوار میں لگا تھا اس پر اتاترک کی تحریر تھی۔

''جن بہادروں نے یہاں خون بہایا۔ اپنی زندگیاں کھو دیں۔ تم اب ایک دوست ملک کی مٹی میں سوتے ہو۔ اس لئے سکون سے آرام کرو۔ ہمارے نزدیک جونیز اور محمدن میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں شانہ بہ شانہ لڑ کر مرے ہیں اور دنیا بھر کی مائیں جنہوں نے اپنے بیٹے دور دراز سے ہمارے ملک بھیجے وہ اپنے آنسو سکھالیں۔ تمہارے بیٹے پھولوں کی طرح ہماری سرزمین میں سکون سے ہیں اور ہماری سرزمین پر جان دینے کے بعد وہ ہمارے بیٹے بھی بن گئے ہیں۔'' اتاترک ۱۹۳۴ء۔

ہر سیاح نے اس جذباتی پتھر کی تصویر بنائی۔ جنگ عظیم میں مسلمان سپاہیوں کو محمدن اور دوسروں کو جونیز کہا جاتا تھا۔ قبرستان بڑا تھا اور تلاش کے باوجود بھی ہمیں کسی ہندوستانی کی قبر نظر نہیں آئی۔ ہر ایک پر صلیب کا نشان بنا تھا۔ اس کا مطلب ہم تو یہ سمجھے کہ ترکوں کے ہمدرد ہر ایک نے جنگ لڑی یا اس لامذہب حکومت نے سب کو عیسائی بنا دیا۔ مراد نے بتایا یہ خیر سگالی جذبات کے اظہار کے لئے صلیب کا نشان بنایا ہے۔ ماشاء اللہ کیا خیر سگالی ہے۔

جب مراد نے محسوس کیا کہ سیاح اتاترک کے الفاظ اور قبروں سے متاثر ہو چکے ہیں اور سردی کا مناسب مقابلہ کر چکے ہیں تو کوچ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسری طرف روانہ ہوئے۔ یہ بھی قبرستان تھا اور مختلف ملکوں کے سپاہیوں کی قبروں سے بھرا تھا ایک جگہ ترک سپاہی نے برطانیہ کے زخموں سے بری طرح چیختے سپاہی کو اپنی خندق سے نکال کر بچایا تھا۔ اس موقعے پر دشمن نے گولہ باری بند کر دی تھی برٹش سپاہی زندہ رہا یا مر گیا یہ تو نہیں بتایا گیا لیکن اس کی یاد میں ایک مجسمہ بنایا اور اُس جگہ لگا دیا۔ جہاں ترک سپاہی برطانوی سپاہی کی مدد کر رہا ہے چند لمحوں کے لئے کوچ رکی اور لوگ اسے دیکھنے اتر گئے۔ جس پگڈنڈی پر کوچ رواں تھی وہ کچی تھی اور بارش کی وجہ سے کیچڑ ہو رہی تھی اس لئے ہم نے کوچ کی کھڑکی سے دیکھنا مناسب سمجھا۔ ڈرائیور بابا کوچ موڑنے کے لئے آگے لے گیا اور دور نکل گیا۔ پھر ایک مناسب جگہ سے دوڑا کر لایا جب تک یادگار دیکھنے والے شوقین خاصہ بھیگ چکے تھے۔ لیکن لوگ گھر سے یہی کچھ

دیکھنے اور لطف اٹھانے آتے ہیں۔ کوچ روانہ ہوئی تو برطانوی سپاہیوں کی یادگاریں آئیں۔ مراد نے کوچ روک دی۔ دو برطانوی سیاح تڑپ کر کوچ سے اترے اور تصویریں بنانے لگے۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے سیاح بھی اپنی یادگاریں دیکھنے گئے۔ اس جگہ سب سے زیادہ آسٹریلیا کے سپاہی مارے گئے۔ ہر سال آسٹریلیا کا وزیراعظم سپاہیوں کی یادگاروں پر پھول چڑھانے آتا ہے۔ ہم وہ سیاح تھے جیسے کسی یادگار پر نہیں جانا تھا پہلی جنگ عظیم کے وقت پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا اور اگر وہاں ہندوستان کا کوئی سپاہی سوتا ہے تو آرام کرنے دیں۔ اللہ ان پر اپنی رحمت نازل کرے۔

پہلی جنگ عظیم میں مرنے والے سپاہیوں کی قبریں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں اور بارش آہستہ آہستہ گر رہی تھی جیسے ان جوان بہادروں کے لئے آنسو بہا رہی ہو جو اپنے گھروں سے پیاروں سے دور اس لئے مر گئے کہ دوسرے زندہ رہیں۔

ہماری ہمسائی کلے کا تعلق آسٹریلیا سے تھا وہ اپنے ملک کے مرنے والے ہزاروں سپاہیوں میں سے کچھ کی قبریں دیکھ کر آئی تھی۔ جنگ عظیم کے سپاہیوں سے تو نہیں لیکن ہمسائی سے ضرور تعلق تھا۔ اس لئے ہم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’آئی ایم سوری ... ‘‘

’’کوئی بات نہیں‘‘ ... وہ مسکرادی۔

اور باہر بارش زور زور سے برسنے لگی۔

....

ارس کی رات

استنبول کا ایک حصہ یورپ میں ہے اور باقی ترکی کے شہر ایشیاء میں۔ درمیان میں سمندر ہے۔ انسان، قبرستان سے زندہ بستیوں میں آتا ہے۔ تو زندگی کی گرمی اسے سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ ہماری منزل چناکلی تھی۔ یہ ایشیاء میں ہے اور وہاں جانے کے لئے سمندر مرمرہ پار کرنا تھا۔ ایک بڑی فیری میں کوچ کھڑی ہوگئی۔ آس پاس کاریں اور گاڑیاں تھیں۔ فیری کی دو منزلیں اور تھیں کچھ سیاح اوپر گئے پھر بارش اور ہوا سے گھبرا کر کوچ میں واپس آگئے۔ ذرا دیر میں ساحل پیچھے ہٹنے لگا۔ فیری آگے بڑھنے لگی۔ 25 منٹ کے سفر کے بعد فیری رک گئی اور کوچ سڑک پر آگئی۔ یہ چناکلی ہے۔ سامنے ایک توپ لگی ہے۔ جس نے دشمن کو جنگ عظیم اول میں 18 مارچ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ ایک میدان میں کمال اتاترک کا مجسمہ لگا ہے...

اس شہر میں ایک یونیورسٹی ہے جس کا نام’’18 مارچ‘‘ ہے جو ترکی کے لوگوں کو اس دن کی یاد دلاتی رہے گی جب انہوں نے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اس شہر کی سڑک سرخ ٹائل اور ٹائل کی بنی تھی۔ بارش کے باوجود فٹ پاتھ صاف ستھرے تھے۔

ایک طرف سے اذان کی آواز سنائی دی اور پھر مسجدوں کے نہ ختم ہونے والے مینار نظر آئے۔ جگہ جگہ ہوٹل تھے۔ بازار کھلے تھے۔ لوگ کاموں میں مصروف تھے۔ مراد نے بتایا اس علاقے میں انگور پیدا کیا جاتا ہے۔ شہر سے نکلے تو چھوٹی چھوٹی بستیاں شروع ہوگئیں پھر رہائشی علاقہ شروع ہوا اور ایک عمارت ہوٹل ارس۔ مراد نے سب کو چابیاں تقسیم کیں۔ ہمیں کمرہ پہلی منزل پر ملا اس میں ایک گیلری تھی جس کا رنگ اور کرسیاں سفید تھیں۔ سامنے گھاس کا میدان اور پودے لگے تھے۔ ہلکی بارش اور سردی تھی۔ یہ گیلری گرمیوں میں لطف دیتی ہوگی۔ سامان رکھ کر ہم دوبارہ استقبالیہ پر آگئے۔ یہاں بے حد موٹی اور خونخوار بلیاں دکھائی دیں۔ جن سے ہماری ساتھی سیاح بھی ڈر رہی تھیں۔ کاؤنٹر کے سامنے لاؤنج میں صوفے پڑے تھے۔ دیوار پر نقش و نگار ابھرے ہوئے تھے۔ ہر سیاح اسے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ ایک طرف ٹیلی ویژن پر پروگرام نظر آرہے تھے جسے صرف مراد سمجھ رہا تھا۔ ایک طرف میزیں اور کرسیاں رکھی تھیں بعض لوگ یہاں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ ہم کاؤنٹر پر گئے۔

"یہاں کارڈ والا فون ہے؟......" ہم نے پوچھا۔

استقبالیہ پر سیاہ آنکھوں اور بھورے بالوں والی لڑکی مسکرانے لگی۔ ہم نے اشاروں سے پوچھا۔ اس نے مراد کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ وہ حیران آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگیں۔ پھر کچھ بولی اور ہاتھ سے بھی کچھ بتانے کی کوشش کی۔ ان کی بے چارگی۔ ہمارے سوال کا جواب نہ دینے کی کوفت اور ہمارے نہ سمجھنے کی پریشانی میں وہ اچھی لگنے لگیں۔ ہم شاید ہمیشہ وہیں کھڑے رہتے کہ ظالم سماج مراد کی شکل میں آ گیا اور بولا۔ "ہوٹل سے نکل کر سیدھے ہاتھ کی طرف ایک مسجد ہے اس میں فون ہے...... وہاں سے بات ہوسکتی ہے۔"

ترک۔ پاک تعلقات بنتے بنتے رہ گئے اور ہم موٹی موٹی بلیوں سے بچتے اپنے کمرے کی طرف آئے اور فون کارڈ لے کر مسجد کی تلاش میں نکل چلے ہوٹل سے باہر آ کر احساس ہوا۔ سردی زیادہ ہے ... ایک بار باہر نکل آئے تو ارادہ کر لیا علاقہ دیکھ ہی لیں۔ چند عمارتوں بعد سیدھے ہاتھ کو مڑے تو مسجد کے مینار صاف نظر آنے لگے۔ اسی کی راہ نمائی میں بڑھتے رہے۔ دو گلیوں کے بعد سڑک آ گئی اور پھر دائیں طرف مسجد۔ ایک صاحب فٹ پاتھ دھو رہے تھے۔ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ نمازی مسجد میں آرہے تھے خوشی کی بات یہ ہے کہ ترکی میں

ہزاروں مسجدیں ہیں اور وہ سب کی سب آباد۔ نمازیوں سے سجدوں سے سجی۔

مسجد کے دروازے کے پاس دو فون لگے تھے۔ ایک خراب تھا۔ دوسرے سے مراد بر آئی واپسی میں ایک سڑک غلط مڑ گئے۔ اس لئے ذرا سا بھٹکے۔ لیکن ہوٹل مل ہی گیا۔ استقبالیہ پر آئے تو احساس ہوا باہر سردی تھی۔ اور اکثر لوگ اس موسم میں اتنی دیر پیدل سفر نہیں کرتے۔

ڈنر کا وقت ساڑھے سات بجے تھا۔ ہم نے مراد سے کہہ دیا تھا کہ ہم سؤر یا اس کی چربی میں پکا کوئی کھانا نوش نہیں کرتے۔ نہ شراب سے شوق کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے کھانے کا بندوبست الگ کیا جائے۔ مراد نے اطلاع دی کہ ترکی میں سور نہ کاٹا جاتا ہے نہ کھایا جاتا ہے۔ ہاں شراب خوب پی جاتی ہے۔ اس کے لئے احتیاط کریں گے۔ لیکن آپ کو مفت میں نہیں دیں گے۔ ادائیگی کرنی ہوگی۔ اس لئے پہلے پوچھ لیں گے۔

مراد کا دعویٰ تھا کہ ترکی زراعت میں خودکفیل ہے۔ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ ترکی میں کھیرا۔ زیتون، دہی اور ڈبل روٹی کثرت سے ہوتی ہے۔ اپنے قیام کے دوران زیادہ طعام اس کا رہا۔

رات کا کھانا سلاد سے شروع ہوا۔ بڑی سی پلیٹ میں ہر قسم کی گھاس اور پات زیتون کا تیل چھڑک کر سامنے لا رکھا۔ اس کے بعد مسور کی دال گھٹی ہوئی شوربے کی صورت میں۔ اس میں نمک اور کالی مرچ ڈال کر پیا تو اچھا لگا۔ دو بڑے پیالے اور ڈبل روٹی اسی کے سہارے معدے میں اتاری۔ اس کے بعد ایک بڑی ڈش میں کسی چیز کا ملغوبہ آیا اس میں چمچے سے ٹٹول کر دس بارہ بوٹیاں مل گئیں وہ کھائیں۔ لیجئے کھانا ختم ہوا اور اب سویٹ ڈش کی باری آئی دو بیرے ایک ٹرالی گھسیٹتے آئے اور ہر ایک سے اس کی پسند پوچھنے لگے۔ اس میں تازہ پھل کسٹرڈ اور ایک جامنی سی کوئی چیز تھی۔ ہم نے پھل کی فرمائش کی۔ ہمارے پاس مصر کا صالح شیخ بیٹھا تھا۔ یہ کینیڈا کی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ ترکی کی سیاحت کے لئے آیا تھا۔ یہاں سے مصر جائے گا۔ پھر واپسی ہوگی۔ اس نے سویٹ ڈش میں جامنی والی چیز پسند کی اور ہمیں بتایا آج پہلی رمضان ہے۔ وہ اس قسم کی چیز لے رہا ہے صالح شیخ کے خیال میں روزہ نہ سہی کم از کم رات کے کھانے کے بعد ایسی چیز ضرور کھائی جائے جس سے جسم و جاں کو معلوم ہو رمضان ہے۔ اس کے برابر آسٹریلیا کی نے بیٹھی تھیں۔ صالح شیخ اسے رمضان کا احترام سمجھانے لگا اور وہ

سویٹ ڈش کھاتے وقت سرہلاتی رہیں۔

آسٹریلیا سے دو خواتین ذرا عمر میں زیادہ اور دنیا دیکھ بھال کر آئی تھیں۔ یہ ذی اور لی تھیں۔ ایک خاتون اپنی صاحبزادی کو لائی تھیں یہ بھی آسٹریلیا سے تھیں۔ لڑکی کا نام الی شا تھا۔ یہ شتر بے مہار تھی۔ پہلے ہی دن سب سے ہائے ہیلو کر لی۔ ہمیں ایک نظر نہ بھائی۔ اس کی ماں کا کہنا تھا یہ 18 سال کی ہے۔ لیکن حرکتوں سے 13 سال سے زیادہ دکھائی نہ دیتی تھی۔

ارس ہوٹل کا عظیم الشان ڈنر ختم ہوا تو کلے نے کہا..... "آیئے آپ کو کافی پلاتے ہیں" ہمیں کیا اعتراض ہوتا۔ ہال سے نکلتے ہوئے صالح شیخ بھی ساتھ ہولیا۔ لاؤنج میں ہم تینوں آ بیٹھے۔ شیشے کی کھڑکیوں سے درختوں کے پتوں پر پھوار پڑتی نظر آرہی تھی۔

ایک صاحبزادی نے میز پر کافی رکھی تو کلے نے کہا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ پورا سفر عباسی کے ساتھ بیٹھ کر کروں گی۔..."

"وہ کیوں....." صالح شیخ نے پوچھا۔

"ایک تو سفر کے دوران یہ گفتگو نہیں کرتے..... اور دوسرے اونگھ کر اپنا سر میرے کاندھے پر نہیں رکھتے....."

تینوں ہنسنے لگے۔

"اگر ایسا ہے تو میں بھی یہ سب کرنے کو تیار ہوں...." صالح شیخ نے ہنس کر کہا۔

"ہم سے بھی تو پوچھیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔ باتیں نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم باہر کے منظر زیادہ دیکھنا چاہتے ہیں....."

"اور سر کاندھے پر نہ رکھنے کی وجہ..." شیخ نے پوچھا۔

"اتنے اچھے کاندھے پر اونگھتا ہوا سر رکھنا۔ کاندھے والے کی توہین ہے۔"

"اگر دل میں ایسا خیال ہے تو ابھی میرے پاس شیخ کا آفر موجود ہے..." کلے نے ہنس کر کہا کافی لذیذ تھی.... اور گفتگو میں دیر ہوگئی۔ اچانک کلے نے گھڑی دیکھی....

"اوہ مائی گاڈ ساڑھے گیارہ بج گئے۔" صبح جلدی اٹھنا۔ ناشتہ اور پھر روانگی ہے...."

اس کے ساتھ ہی محفل ختم ہوئی۔

....

ہیلن کے بغیر ٹرائے

ترکی میں کسوداسی ایک تاریخی مقام ہے۔ یہاں دنیا کا ایک قدیم اور مشہور شہر ہے جو ہیلن کی وجہ سے مشہور ہوا۔ آج اسی کے دیدار کو جانا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی۔ سرد ہوا بھی تھی۔ صبح ساڑھے سات بجے ارس ہوٹل کو خدا حافظ کہا اور چل نکلے سڑک کے دونوں طرف درخت، کھیت اور دور دور پہاڑ ان پر زیتون کے درخت۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ٹرائے آ گیا۔ یہ کبھی شہر تھا۔ اب کچھ نہیں۔ سامنے ایک بڑا لکڑی کا گھوڑا بنا ہے۔ لوگ اس کے سامنے اور اوپر چڑھ کر تصویریں بناتے ہیں۔ ایک طرف دو دکانیں ہیں۔ دوسری طرف باتھ روم ہیں۔ بظاہر تو کوئی دیکھنے کی چیز نہیں تھی۔ ہم اطمینان سے بیٹھے تھے۔ کوچ رکی تو سمجھ گئے کہ تصویریں اتارنے کی رسم ہوگی اور آگے چل نکلیں گے۔ لوگ اپنے کوٹ پہنے، کیمرے سنبھالنے لگے اور ایک ایک کرکے نیچے اتر گئے۔ ان میں سے ایک ہم بھی

تھے۔ اینٹوں سے بنے راستے پر چل کر مراد کے ساتھ ایک شیڈ میں کھڑے ہوئے تو اس نے دیوار پر لگے نقشے کی مدد سے سمجھانا شروع کیا۔

ٹرائے شہر 3500 قبل مسیح میں تعمیر ہوا۔ اس کی نو تہیں ہیں۔ یعنی نو بار برباد ہوا اور ایک شہر پر دوسرا شہر آباد ہوا۔ ایک رنگین نقشے کی مدد سے ہر شہر واضح تاریخ کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ یہ یونانی، رومن کا پیریڈ رہا ہے اور اب موہن جودڑو کی طرح اس کے آثار ملتے ہیں۔ ہماری دلی بھی سات بار اجڑی، بسی۔ بس فرق یہ ہے کہ اوپر نیچے آباد نہیں ہوئی ہم نے مراد سے پوچھا..... "ٹرائے اب کب بسایا جائے گا......" اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

ٹرائے کے بارے میں عجیب کہانی مشہور ہے۔ 3200 قبل مسیح پہلے ٹرائے میں کاشتکاری اور ماہی گیری کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ ان کے بادشاہ پرائم کی ملکہ حکوبہ نے خواب میں دیکھا کہ اس کے معدے سے آگ نکل رہی ہے۔ جس کا دھواں سارے شہر کی دیواروں کو ڈھک رہا ہے۔ یہ خواب جب اس وقت کے عالموں نے سنا تو تعبیر دی ملکہ کے پیٹ سے جو بچہ پیدا ہوگا اسے فوراً ہلاک کر دیں ورنہ وہ ٹرائے شہر کو برباد کر دے گا۔ ملکہ حاملہ تھی اس کے بچہ پیدا ہوا تو اسے فوراً قتل کا حکم دیا گیا۔ جو شخص بچہ لے کر گیا اسے ترس آ گیا اور وہ بچہ جنگل میں چھوڑ آیا جسے ایک گڈریا لے گیا۔ اسے پال کر بڑا کیا اس کا نام پیرس رکھا۔ وہ بے حد حسین، بہادر اور عقلمند تھا۔

ایک بادشاہ نے اولمپس پہاڑ پر شادی کی دعوت کی سب کو بلایا لیکن ارس دیوی کو دعوت نہیں دی۔ کیونکہ وہ اکثر لوگوں کو ناراض کر دیتی تھی اور دیوتا اسے پسند نہیں کرتے تھے ارس کو غصہ آیا اور اس نے شادی کے ہال میں ایک سونے کا سیب پھینک دیا جس پر لکھا تھا۔ "جو سب سے حسین ہو۔" اس بات پر ہر دیوی لڑنے لگی، کہ وہ سب حسن و جمال میں یکتا تھیں اور ہر ایک یہ سیب چاہتی تھی۔ آخر میں تین دیویوں کو اس سیب کے لئے چنا گیا۔ ہیرا، پالاس اتھینا، اور اپارو ڈایکس یہ تینوں ایک جج کے پاس پہنچیں۔ اس نے کہا تم تینوں حسین و جمیل اور خوبصورتی میں لازوال ہو۔ میں کیسے انتخاب کرسکتا ہوں تم لوگ ماؤنٹ ایڈا پر جاؤ وہاں پیرس ملے گا وہ فیصلہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ شہزادہ ہے اور حسن کا پرستار۔ یہ دیویاں دیوتا کے ذریعے پیرس کے

پاس پہنچیں تو وہ ان کے حسن کو دیکھ کر چکرا گیا اور اسے فیصلہ کرنے میں دقت ہوئی تب تینوں نے اسے رشوت کی پیشکش کی ہیرا نے کہا وہ اسے یورپ اور ایشیا کا بادشاہ بنا دے گی اتھینا نے اسے عقلمند اور طاقتور بادشاہ بنانے کی پیشکش کی۔ اپارو ڈایکس نے پیرس کو دنیا کی سب سے حسین عورت پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ شہزادے نے حسین عورت کے چکر میں سیب اپارو ڈایکس کو دے دیا۔ دو دیویاں ناراض ہوگئیں اور انہوں نے فیصلہ کرلیا وہ ٹرائے کو برباد کر دیں گی۔ اپارو ڈایکس شہزادے پیرس کو حسب وعدہ اسپارٹا لے آئی جہاں دنیا کی حسین ترین عورت ہیلن رہتی تھی جو مِنی لاؤس کی بیوی تھی۔ وہ اسپارٹا کا بادشاہ تھا۔ اس نے پیرس کو بہت عزت دی مہمان نوازی کی اور اس پر مکمل اعتماد کیا۔ بادشاہ کسی کام سے اسپارٹا سے باہر گیا۔ واپس آیا تو ہیلن پیرس کے ساتھ ٹرائے جا چکی تھی۔ بادشاہ نے اسے اپنی بے عزتی سمجھی تمام یونانی بادشاہوں کو جمع کیا اور ہیلن کو واپس لانے کے لئے ٹرائے کا سفر کیا۔ اس میں سینکڑوں جہاز اور ایک لاکھ بہادر سپاہی شامل تھے۔ انہوں نے ٹرائے کے ساحل پر پڑاؤ کیا۔ پرائم کے بہت سے بہادر بیٹے اور آس پاس کے بادشاہ بھی مدد کو آ گئے۔ جنگ شروع ہوئی اور یونانی بادشاہ کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ یہ جنگ دس سال تک لڑی گئی کچھ دیوتا ٹرائے والوں کے ساتھ تھے باقی یونانیوں کے ہموا تھے۔ جب دشمن لڑتا ہوا ٹرائے کے قلعے کی دیوار تک آ گیا تو پرائم نے طے کیا کہ پیرس اور ہیلن کا شوہر بادشاہ مِنی لاؤس آپس میں لڑ کر فیصلہ کرلیں۔ یہ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو ناراض دیویوں نے لڑنے نہیں دیا اور پیرس بھاگ کر قلعے کی طرف آیا۔ لیکن ٹرائے والوں نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ وہ کہیں روپوش ہوگیا۔ کچھ کا خیال ہے وہ ٹرائے شہر میں داخل ہوگیا تھا اور اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

یونانیوں نے ٹرائے کو برباد کرنے کے لئے ایک چال چلی۔ لکڑی کا ایک بڑا گھوڑا بنایا اس میں اپنی فوج کے بہادر جوان چھپا دیے۔ ایک سپاہی کو باہر چھوڑا اور جہاز لے کر سمندر میں روانہ ہوگئے۔ رات کو یہ کارروائی ہوئی۔ صبح ٹرائے والوں نے دیکھا یونانی بھاگ گئے تو وہ بہت خوش ہوئے اور باہر نکل کر اکیلے روتے سپاہی سے یونانیوں کے جانے کی کہانی سنی اور گھوڑے کو گھسیٹ کر قلعے میں لے آئے۔ اس رات سپاہی گھروں کو لوٹ گئے اور فتح کا جشن منایا جانے لگا رات کے آخری پہر لکڑی کے گھوڑے سے یونانی سپاہی ایک ایک کر کے نکلے اور

قتل عام شروع کر دیا۔ شہر کو آگ لگا دی۔ ہیلن کو گرفتار کر کے اس کے شوہر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا جب یونانی سپاہی جا رہے تھے تو ہیلن ان کے ساتھ تھی اور ایشیا کے شہر ٹرائے میں خون، لاش اور ہر طرف دھواں تھا اور یوں اس کہانی کا انجام ہوا۔

اس عظیم شہر کے کھنڈرات پر ہم کھڑے تھے جس کے بارے میں مراد بتا رہا تھا کہ اوپر نیچے نو شہر آباد تھے۔ باتیں کرتے وہ ہمیں پتھر سے بنے راستے پر لے آیا۔ گھاس پر چند پرانے زمانے کے برتن رکھے تھے ایسے جن میں سندھ پنجاب کے دیہاتوں میں اناج ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ یہ کھدائی سے نکلے تھے۔ ہم دیکھنے لگے۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ پھر ایک چوڑی گلی جو چند قدم بعد ختم ہوئی تو نیچے کھائی آ گئی۔ مراد کونے پر کھڑے ہو کر کھدائی کی تفصیل بتانے لگا۔ پھر اچانک ایک شکستہ زینہ اتر کر نیچے چلا گیا۔ جب وہ اتر رہا تھا ہم نے دل میں کہا یہ گائیڈ کا پیشہ بھی عجیب ہے مراد غریب کو بغیر کسی سہارے کے شکستہ بے ڈھب سیڑھیوں سے اتر کر نیچے جانا پڑا۔ اب ہم انتظار کر رہے تھے کہ وہ نیچے سے ہمیں بتائے گا اس جگہ کی تاریخ کیا ہے۔ لیکن اس نے زور سے کہا۔ ’’نیچے آ جائیے۔‘‘ ہم سیڑھیوں کے نزدیک تھے اس لئے ہمیں سب سے پہلے سیڑھی سے اترنا تھا۔ ہم اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ خطرناک سیڑھیاں اب ہمیں اترنی تھیں اور وہ بھی تیزی سے باقی سیاح پشت پر تھے۔ ہم سمجھ گئے ٹرائے کا سارا چکر اس لئے بنایا ہے کہ ہمیں اس زینے سے نیچے گرا دیں بلکہ ہم خود گر جائیں۔3500 قبل مسیح کی شکستہ سیڑھیاں۔

’’مسز عباسی جلدی کریں... ‘‘مراد کی آواز آئی۔

ہم نے صدق دل سے اپنے خدا کو یاد کیا اور سیڑھی پر پہلا قدم رکھا پھر دوسرا، اس کے بعد توازن برقرار رکھ کر دوسری سیڑھی پر، نہ جانے وہ کتنی سیڑھیاں تھیں۔ لیکن یوں محسوس ہوا ساری ترکی میں صرف سیڑھیاں ہی سیڑھیاں ہیں۔ وہ ختم لینے کا نام ہی نہ لیتی تھیں ہم ان لوگوں کو یاد کرنے لگے جنہوں نے لفٹ ایجاد کی ہے... سیڑھیوں پر ریلنگ لگائی ہے پھر معجزہ ہو گیا سیڑھیاں ختم ہو گئیں اور ہم اونچے نیچے راستے پر آ گئے اور ہمارے ساتھ دوسرے سیاح بھی۔ یہاں دو طرف بڑے بڑے پتھروں کی دیوار تھی جن کے بارے میں مراد بتا رہا تھا۔ اس کی ساخت مضبوطی اور تاریخ۔ ہمیں صرف ایک خوف تھا اسی راستے سے واپسی ہو گی تو کیا ہو گا!! باتوں میں معروف مراد آگے بڑھا دونوں طرف دیوار ختم ہوئی اور عجیب طرح کے ٹیلے شروع

ہو گئے اور مراد کا حکم کہ ان پر چڑھو۔ چار سیڑھیاں ٹوٹی ہوئی تھیں بغیر سہارے کے وہ چڑھیں تو چھ نیچے اتر گئیں۔ یہ سب ٹوٹی پھوٹی اور بے ہنگم تھیں۔ پہلے ہم صرف نیچے دیکھتے جب سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ اتر جاتے تب اطمینان کا سانس لے کر اِدھر اُدھر دیکھتے اور دل ہی دل میں ہیلن کو برا بھلا کہتے جاتے کہ لعنت ہو اس عورت پر کہ اچھے خاصے بادشاہ کو چھوڑ کر ایک نکمے شہزادے کے ساتھ بھاگ لی جس کے نتیجے میں پورا ٹرائے تباہ ہوا اور ہمیں ملے تو کھنڈر۔

مراد نے ایک ٹیلے کا رخ کیا۔ اس کے پیچھے سیاح چل پڑے ان میں ہم بھی شامل تھے۔ شکستہ، ٹوٹے، اکھڑتے بے ڈھب پتھروں پر پاؤں رکھتے۔ اوپر چڑھنے لگے۔ وہاں کیا تھا ایک طرف کھائی اور دو پہاڑ ان کے درمیان کھیت۔ اس کی بھی ایک تاریخ تھی۔ غالباً یونانی اس میدان میں دس سال تک ایک بے وفا عورت ہیلن کے لئے جنگ لڑتے رہے۔ یہاں سے مراد کو منظر اچھا نظر آ رہا تھا سیاح تو ویسے ہی باؤلے ہوتے ہیں۔ وہ تصویریں بنانے لگے۔ اس سے بہتر ہے انسان جہاز کی کھڑکی سے یا ہیلی کاپٹر سے اس قسم کے میدان اور کھیت دیکھ لے۔ لیکن سیاح کا کام دیکھنا اور تصویریں اتارنا ہے۔ ہم سوچتے ہیں اگر دنیا میں سیاح نہ ہوتے تو کیمرے اور فلموں کے لاکھوں رول کیسے فروخت ہوتے۔ یوں یہ انڈسٹری اس طرح نہ پھلتی پھولتی۔

ٹیلے سے اتر کر سیڑھیاں پار کر کے ایک لکڑی کے پل پر چڑھے۔ دونوں طرف گہرائی تھی مراد نے بتایا یہاں سے ایک جرمن نے ٹرائے کا خزانہ نکالا۔ وہ ایک ماہر آثار قدیمہ چلی مان تھا یہ جرمن تھا اسے آثار قدیمہ سے عشق تھا۔ ٹرائے آیا تاکہ پرانا خزانہ تلاش کر سکے۔ اپنی روسی بیوی کو طلاق دی اور یونانی عورت صوفیہ سے دوسری شادی کر کے یہاں آ کر عثمانی بادشاہوں سے اجازت لے کر کھدائی شروع کی اور پیرس کے باپ پرائم کا خزانہ نکال لیا اور کسی طرح ترکی سے باہر لے گیا۔ پہلے وہ خزانہ جرمنی میں رہا پھر جنگ عظیم کے بعد روس کے میوزیم میں رکھا گیا۔ سنا ہے ہیلن کے گلے کا ہار ماسکو کے میوزیم میں رکھا ہے۔ کچھ حصہ استنبول کے عجائب گھر میں ہے اور اب بھی بہت خزانہ اندر دفن ہو گا۔

ہم نے مراد سے پوچھا۔ ’’تم کوئی خزانہ نکالنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔‘‘ وہ ایک آہ بھر کر رہ گیا۔

ٹرائے کا علاقہ ہمیں پسند نہیں آیا۔ پہلے ایک بے وفا کے لئے شہر صفحۂ ہستی سے مٹ

گیا۔ پھر وہ جرمن جو خزانے کی تلاش میں آیا اسے بھی پہلی بیوی کی قربانی دینی پڑی۔ خواتین اس علاقے سے ہوشیار رہیں اور مرد بھی احتیاط رکھیں۔ لکڑی کے پل سے دوسری طرف اتر گئے۔ یہاں ترانے والوں کے چھوٹے چھوٹے تھیٹر تھے جہاں روساء موسیقی سے لطف اندوز ہوتے۔ اس کے بعد کچھ گھروں کے حصے جو شکستہ ستون اور دیواریں...... اور ان کے درمیان بغیر ٹوٹے پتھروں کی ایک پگڈنڈی تھی جو کوچ تک لے جارہی تھی...... ترائے میں اُس وقت سب سے اچھی یہی پگڈنڈی لگی۔

****

اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

ازمیر کا ساحل

کوچ جنگل سے گزر رہی تھی دونوں طرف ہرے درخت تھے۔ جن میں زیتون لگے تھے مراد کا کہنا تھا پہاڑوں اور جنگلوں میں یہ خود بخود اگ آتے ہیں۔ ہمیں اس کی بات پر شک تھا مگر اظہار نہیں کیا۔ .. ترکی ان ملکوں میں شامل ہے جو دنیا میں زیتون اگاتے ہیں۔ جگہ جگہ نارنگیوں کے باغ بھی آتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں بھی شاخیں نارنجی پھلوں سے لدی تھیں۔ ان کا ذائقہ کھٹا ہوتا ہے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ترکی میں نارنگی کا رس نہیں ملتا۔ پورے ملک میں کوئی بوتل یا ڈبا نہیں ملا۔ ہوٹل میں تازہ رس نکال کر دینے کا رواج ہے۔ ہم چاہتے تھے کوچ میں ساتھ لے کر چلیں جب جی چاہے ایک گھونٹ لے کر فرحت اور راحت کا سامنا کریں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بلکہ بعض ہوٹلوں میں ناشتے یا رات کے کھانے پر بھولے بھٹکے نارنگیاں نظر آتی تھیں تو جسم میں مختصر اور ذائقے میں ترش۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوا سارے ملک

میں نارنگیاں سجاوٹی ہیں صرف دکھانے کے لئے۔

جنگل سے کوچ گزر رہی تھی تو بارش ہونے لگی۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں پھر شہر آنے لگے۔ سڑکیں پھیل جاتیں۔ پھر سکڑ کر ایک رہ جاتی اس پر ہم سفر کرتے ترکی کے شہروں میں چاہے وہ کتنے ہی چھوٹے ہوں اپارٹمنٹ میں رہنے کا رواج ہے۔ ان کی تعمیر کثرت سے ہوتی ہے۔ مراد کا خیال ہے ملک میں افراط زر اور غربت کی وجہ یہی غیر پیداواری سرگرمی ہے۔

ایک جگہ کافی کے لئے رکے تو فوراً کوچ کو چاروں طرف سے دھویا گیا۔ ڈرائیور باکی اور ہوٹل کے باہر دو آدمی نل سے پانی ڈالنے اور بڑے برش سے کوچ کے شیشے صاف کرنے لگے۔ ناشتہ کئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن ہر ایک کافی کی طرف لپکا۔ بعض نے باتھ روم کا رخ کیا۔ اس کا ٹکٹ 2 لاکھ لیرا تھا۔ یہاں ترکی کے جھنڈوں کے ساتھ دوسرے ملکوں کے جھنڈے بھی لہرا رہے تھے لیکن پاکستان کا نہیں تھا۔

کوچ روانہ ہوئی تو منظر بدل گیا۔ بائیں طرف نیلے پانی کی ایک طویل جھیل پھیل گئی۔ اس کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر جاگتا کام کرتا مصروف پھر یہ گزر گیا تو پرگامہ آ گیا۔ لوگوں سے بھرا بازار، ایک جگہ رک گئے۔ مراد نے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا اور سب کو لے کر داخل ہو گیا یہ سگلام ریسٹورنٹ ہے۔

یہ معروف ہوٹل ہے۔ یہ ایک طرف تندور لگا ہے جس سے گرم گرم نان نکل رہے تھے۔ دوسری طرف لائن سے شیشے کے کاؤنٹر میں کھانے سجے تھے۔ مراد نے کھڑے ہو کر سب کا آرڈر لیا۔ ہم نے چکن کباب اور پانی منگایا گرم نان مفت تھے اس سہولت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ وہاں ہر طرف ترکی میں لکھا تھا صرف ایک جملہ انگریزی کا تھا۔ ''آپ کی پلیٹ کے لئے منفرد نام''۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سفر کے دوران جو بات سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے لئے ذہن پر زیادہ زور نہیں دینا چاہئے۔ اس لئے روٹی کھائی۔ چکن کباب چکھے۔ پانی نوش کیا اور 30 لاکھ لیرا دے کر باہر نکلے۔ سامنے پوسٹ آفس تھا۔ ہم عمارت میں داخل ہو رہے تھے تو ایک گھبرائی بوکھلائی خاتون سامنے آ گئیں اور پوچھا ''بینک کہاں ہے...'' پوسٹ آفس کے برابر ا! ا! کا بورڈ ہم دیکھ چکے تھے۔ ہم نے رہنمائی کی تو وہ بے حد ممنون ہوئیں یہ آئیڈیا تھیں۔

ہماری سفر کی ساتھی، ایک دن ریسٹورنٹ میں اپنے خاندان کی تصویریں دکھانے لگیں۔ اپنی بیٹی کی تصویر دکھائی پھر اس کی خاصی بڑی بیٹی کی سالگرہ کی تصویر دکھا کر خوش ہونے لگیں۔ اسی طرح بیٹے اور اس کے بیٹے کی تصویریں دکھانے لگیں یعنی موصوفہ پرنانی اور پردادی تھیں۔ اپنے منہ سے عمر ستر سے اوپر بتا رہی تھیں۔ ہم نے انہیں غور سے دیکھا۔ بڑی بی کو اس عمر میں سیاحت کا شوق ہوا ہے۔ وہ کہنے لگیں سال میں دو بار سیر کو نکلتی ہوں۔ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتی ہیں۔ ٹکٹ وکٹ کا انتظام کر کے سفر کرتی ہیں۔ ہم ان کی ہمت کی داد دینے لگے اور اپنے سفر کے بارے میں ہم بھی ان سے لمبی لمبی گپ لڑانے لگے۔ وہ حیران ہو کر ہنسنے لگیں۔

جب تک آئیڈیا نے ڈالر کیش کرائے۔ ہم نے پوسٹ آفس سے فون کارڈ خریدا۔ باہر نکلے تو ایک دکان والے نے دبوچ لیا اور اصرار کرنے لگا کہ کچھ خرید لیں۔ ہم نے استنبول کی کتاب خریدی تو اس نے ملا نصیر الدین کا گدھے پر الٹا بیٹھا ایک مجسمہ بھی دے دیا اور قیمت بھی بہت کم کر دی۔ ترکی میں قیام کے دوران ہمیں لیرا کبھی سمجھ میں نہیں آئے۔ اس لئے امریکی ڈالر میں قیمت پوچھتے تب جا کر ادائیگی کرتے۔

جہاں سگلام ہوٹل تھا اس کے سامنے ایک چوراہا اور ایک پرانی مسجد تھی وہاں ظہر کی اذان ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں آدمی سربسجود ہو گئے۔ اس بات کی خوشی ہوئی کہ مسجدیں آباد ہیں۔

پرگامہ کی ایک گرم دوپہر کے بعد کوچ میں بیٹھے تو شیخ صالح ہمارے سامنے ایک پیکٹ لے کر آیا اور کہا ''اس میں سے کچھ لے لیں'' یہ سوکھی ہوئی خوبانیاں تھیں جو ہمیں پسند نہیں۔ لیکن صالح نے ضد کی ''یہ رمضان ہے۔'' اور ہم نے رمضان کے احترام میں خشک خوبانی اٹھالی۔ اس نے بس میں ہر ایک کو دیں اور سب نے رمضان کی وجہ سے کھائیں۔ صالح کے خیال میں وہ ثواب کا کام کر رہا تھا۔ مراد نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور کوچ میں سوار ہو گیا۔ ہماری منزل ازمیر تھی۔ جو ترکی کا تیسرا بڑا اور اہم تجارتی شہر ہے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے اس کی آبادی 62 ملین تھی۔ ہم جا رہے تھے تو ازمیر کی آبادی کا بڑھنا ضروری تھا۔

راستے میں کسی وقت نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک عظیم الشان شہر میں دیکھا۔ ہر طرف روشنی، چوڑی سڑکیں اور جگمگاتے بازار، بائیں طرف دور تک پھیلا سمندر، ہم سمندر کے

کنارے چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔

سمندر کے کنارے سیمنٹ کا راستہ اور بڑی فٹ پاتھ ہے جس پر جگہ جگہ بینچیں بنی ہیں۔ مراد نے کوچ ایک طرف روک دی اور بتایا "سامنے بینک ہے اس طرف واش روم ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد یہاں سے روانہ ہوں گے۔ آپ لوگ ساحل سمندر دیکھ لیں۔" اس کا مطلب تھا ازمیر میں ہمارا طعام و قیام نہ تھا۔

اس سرزمین پر چہل قدمی کے لئے ہم کوچ سے اتر گئے اور ایک گروپ کے ساتھ ایک طرف چل دیئے یہ لوگ باتھ روم کی تلاش میں تھے وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک طرف خواتین دوسری طرف حضرات اور جب ہم اندر داخل ہوئے۔ 2 لاکھ لیرا کا سوال ہوا۔ ہم نے جیب ٹٹولی صرف 1 لاکھ مل سکے باقی ایک کروڑ کے نوٹ تھے۔ ہمارے ساتھ برطانیہ کی خاتون ایلی اور ان کے شوہر تھے۔ انہوں نے جو ہمیں جیبیں ٹٹولتے دیکھا فوراً اپنے شوہر سے لے کر ایک لاکھ کا سکہ دے دیا۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور باتھ روم میں گئے۔ جو دنیا کا سب سے گندا اور بدبودار ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہمارے ساتھیوں کا قافلہ سڑک پار کرکے بینک جانا چاہتا تھا۔ اس کے بھی مرحلے تھے۔ ٹریفک لائٹس بند ہونے پر سینکڑوں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سڑک پار کرتے تھے۔ ہمیں بینک سے کوئی کام نہ تھا اس لئے کوچ کی طرف روانہ ہوئے اس شام ہم نے ہزاروں صاف ستھرے، جہرے والی لڑکیاں اور لڑکے دیکھے جو نیلے کوٹ پتلون پہنے تھے۔ لڑکیاں سروں پر اسکارف باندھے ہوئے تھیں۔ ترکی میں کوئی عورت سر پر اسکارف باندھ کر سرکاری عمارت میں داخل نہیں ہوسکتی اگر کوئی ملازم لڑکی ایسا کرتی ہے تو اسے نوکری سے برخاست کر دیا جاتا ہے کیونکہ ترکی ایک سیکولر ملک ہے۔ مصر کے صالح شیخ نے ایک دن مراد سے کوچ میں کہا تھا۔

"ترکی کسی بھی سیکولر ملک سے زیادہ سیکولر ہے"...... مراد نے برا مانا ہوگا لیکن بولا نہیں۔ ...ترکی میں تمام خواتین سر پر اسکارف باندھتی ہیں۔ سرکاری عمارت میں جاتے ہوئے اتار دیتی ہوں گی۔ یہ ہم نے دیکھا نہیں۔

سمندر کے کنارے چھابڑی والے تھے جو عجیب و غریب چیزیں فروخت کر رہے تھے۔ ان میں کوئی ایسا پھل تھا جو آگ پر جلا کر دیا جاتا تھا۔ کئی قسم کے لاٹری ٹکٹ بکتے دیکھے۔

چائے والا بھی آواز لگا رہا تھا۔ ترکی میں چائے کو چائے ہی کہا جاتا ہے...... ہزاروں لوگ کام سے لوٹ رہے تھے۔ نیلا لباس کالج کا یونیفارم ہے۔ ان سب کے چہروں پر معصومیت تھی۔ ایک بھولا پن۔ لڑکیاں غیر معمولی دبلی تھیں۔ بڑی عمر کے لوگ غریب اور پریشان نظر آتے تھے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی دست سوال نہیں پھیلا رہا تھا۔ ایک غیرت مند قوم معلوم ہوتی تھی۔ چاروں طرف پانی بکھرا ہوا تھا۔ شاید تھوڑی دیر پہلے بارش ہوئی تھی۔ سمندر پر دھواں دھواں تھا۔

جب ہم بہت دور تک چلے گئے تو اندازہ ہوا کہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ جہاں کوچ کھڑی تھی وہ جگہ تو اب خالی ہے خیال آیا شاید یہاں کوچ کھڑی کرنے کی اجازت نہ ہو ہم نے غلط سنا ہو...... مراد کسی اور طرف چلا گیا ہو ہم ازمیر میں اکیلے نہ رہ جائیں اب کیا ہوگا؟ ہم خدا کا نام لے کر چلتے رہے اور ڈرتے رہے یہاں تک کہ کوچ نظر آگئی۔ ......اور ایک بینچ پر مراد آسٹریلیا کی لی اور زے سے گپ شپ کرتا نظر آیا۔ اس کی پشت پر ایک بڑا سنگ مرمر کے فرش والا چبوترہ تھا۔ جس پر کمال اتاترک کھڑے تھے۔ دو لکیریں بنی تھیں۔ اس میں کمال اتاترک سپاہیوں کی کمان کر رہے ہیں اور وہ ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ ہم سمجھے یہ باہر سے آنے والے کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں کہ اس قسم کا ایک مجسمہ نیویارک میں اسٹیچو آف لبرٹی کے نام سے مشہور ہے جو باہر سے آنے والوں کو روشنی دکھاتا ہے...... کمال اتاترک نئی ترکی کے بانی ہیں۔ ان کا نام انور تھا۔ استاد نے خوش ہوکر لقب دیا۔ کمال اور اتاترک کا مطلب۔ ترکوں کا باپ یہ آخری عثمانی بادشاہ سلطان عبدالمجید ثانی کے جرنیل تھے۔ اس سے ناراض ہوکر چلے گئے اپنی ایک جماعت بنائی اور ترکی سے بادشاہت ختم کرکے جمہوریت نافذ کر دی۔ بادشاہ کو جلاوطن کر دیا۔ 1923ء میں ترکی نے چولا بدلا اور ابھی تک پہنے ہوئے ہے۔ ہم متاثر ہوئے یا مراد کے سامنے اس طرح اظہار کیا۔ ازمیر ایک صنعتی ملک ہے۔ جہاں آلودگی بہت ہے۔ صفائی کی طرف توجہ نہیں۔ جب تک ازمیر کے علاقے میں رہے ہر طرف کوڑا کرکٹ دکھائی دیتا رہا۔ ایشیاء کے بڑے شہر کی ساری خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ ازمیر چاروں طرف پھیلا ہے۔ بارش کی وجہ سے بھیگا ہوا تھا۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ اس شہر میں دو گھوڑوں کی بگھی چلتی ہے حصار مسجد مشہور ہے 16 ویں صدی میں تعمیر ہوئی 19 ویں صدی میں دوبارہ بہتر بنایا گیا اس کے علاوہ بھی سینکڑوں

مسجد یں ہیں۔ شام ہوتے ہی جس ہوٹل میں پہنچے اس کا بڑا چرچا تھا۔ کساداسی کے علاقے میں سمندر کے کنارے واقع تھا۔ ازمیر ہوائی اڈے سے 80 کلو میٹر دور ہے۔ 305 کمرے۔ ایک کنگ سائز غالباً بادشاہ کے لئے۔ 5 سویٹ، 40 فیملی روم، ڈانس اور بیلے رقص، ڈسکو، فٹنس سینٹر، ساحل پر فٹ بال کھیلنے کا بندوبست، ہوٹل کے اندر سوئمنگ پول اور باہر سمندر میں چھلانگ لگائی جاسکتی تھی۔ بڑا ہوٹل تھا۔ کاؤنٹر پر میلہ لگا رہتا۔ ادھر ادھر دکانیں تھیں اندر اور باہر تمام کھیلوں کی سہولت تھی۔ ہوٹل کے بروشر میں ہوش اڑانے اور نیند بھگانے والی تصویریں چھپی تھیں۔ بعض پر نظر پڑی تو دیر تک نہ بتی اصل کیا ہوگی۔ اس کا تصور کیا اور امریکی ڈالر کی کفایت شعاری ذہن میں رکھی۔ ایک تصویر میں تو خواتین وحضرات انتہائی مختصر مختصر لباس میں یا شاید بے لباس ڈریس کی مشق فرما رہے تھے۔ ہم دوران سفر اس قسم کی نازیبا حرکتوں کو پسند نہیں کرتے اس لئے تصویر دیکھ کر برا مانتے رہے۔ یہ سب معصوم مسافروں کو بھڑکانے ورغلانے اور غلط راہ پر چلانے کا منصوبہ ہے۔ خیر ہم کیونکہ مسافر تھے اس لئے کاؤنٹر پر گئے تاکہ کم از کم بیلی رقص کا ٹکٹ پوچھ کر ان کی ہمت افزائی کریں استقبالیے پر جو صاحبزادی کھڑی تھیں جب وہ گاہکوں سے فارغ ہوئیں تو فرمایا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں۔'' ہم نے ان کی خدمات کے بارے میں سوچا اور پوچھا۔''

''ناچ دیکھنا ہے۔''

''کیا'' وہ حیران رہ گئیں۔ وہ یوں حیران ہوئیں جیسے ہم ان کا ڈانس دیکھنا چاہتے تھے اس میں کیا حرج تھا۔ لیکن اظہار کیسے کرتے بس اتنا کہا۔

''یہ والا..... ''اور ہوٹل کا بروشر سامنے کردیا۔

''اوہ بیلی''..... وہ مسکرائیں۔

''یہ رات کو ہوتا ہے.....'' ان کا خیال تھا ہم دن میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

''اس کا ٹکٹ کیا ہے.....؟'' ہم نے پوچھا۔

''چھ کروڑ ساٹھ لاکھ لیرا۔..!''

اتنا مہنگا ڈانس تو مصر کے شاہ فاروق نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ہم شکریہ ادا کرکے واپس

آگئے اور شیشے کی نبی رنگین لفٹ میں بیٹھ کر اپنے کمرے میں آئے ہماری گیلری سے دور تک سمندر پھیلا نظر آتا تھا۔ ایسا کہ اگر پانی میں چھلانگ لگانے کے ماہر ہوتے۔ کود جاتے۔ لیکن کبھی زندگی میں کوئی ڈھنگ کا کام نہ سیکھا کودے بھی تو حسن اور جمال پر۔ چھلانگ ماری تو مالی کے ڈر سے درخت سے اور والد سے ڈر کر دیوار سے۔

باتھ روم میں ایک ہدایت لکھی تھی براہ کرم ''قدرت کو محفوظ کرنے کے لئے ہم سے تعاون کریں۔ پانی کم استعمال کریں اور ڈٹرجنٹ استعمال نہ کریں نیچے ایک کاکروچ اور مکھی منہ پھاڑے ہنس رہے تھے۔ ہم نے ان کی درخواست پر عمل کیا۔ منہ دھونے کا ارادہ ملتوی کیا اور صرف ہاتھ دھوئے اور صابن سے پرہیز کیا۔ باہر نکلے تو دیکھا۔

ای ڈی بستر پر دراز ہے۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور بولا۔

''نیچے لابی میں چلتے ہیں۔'' ہمیں کیا اعتراض ہوتا۔

ہم لفٹ کی طرف بڑھے۔ ای ڈی زینے سے نیچے اترنے لگا۔ جب ہم نیچے پہنچے تو یہ پہلے آچکا تھا اور اس بات پر خوش تھا۔ وہ سیدھا اترتا ہوا آیا ہماری لفٹ دیر میں آئی۔ پھر ہر طور پر رکی بھی ..... ایک سہولت ہے اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں...... اگر ای ڈی زینہ اتر کر خوش ہو رہا ہے تو اس کا نصیب۔

لاؤنج میں بل مل گئے۔ یہ صاحب دراز قد اور سفید بالوں والے تھے آواز ذرا بھاری تھی۔ ہم نے بھولے سے کہہ دیا تھا۔ ''آپ کی آواز ریڈیو کے لئے نہایت مناسب ہے'' اس دن سے وہ ہم پر مہربان تھے۔ بل کا خیال تھا عورتیں ان پر فدا ہوجاتی ہیں۔ اس لئے ساتھی خواتین کے نزدیک زیادہ پائے جاتے تھے۔ ادھر اُدھر کے قصے بھاری آواز میں سناتے جب کوئی ان سے بات کرتا۔ بار بار پوچھتے ''کیا کہا''...... اونچا سننے کا بہانہ کرتے۔ سامنے والا ان کی سنتا رہتا۔ جب سے مراد نے بتایا تھا کہ ترک روس کے علاقے سے آئے تھے یہ بھی روسی بن گئے تھے۔ نیویارک کے علاقے پورٹ اسمتھ میں رہتے اور اس جگہ کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے ان کے خیال میں پورٹ کا علاقہ سب سے مہنگا ہے۔ اکثر اپنے مکان کی تصویریں بھی دکھاتے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ امریکہ میں جس گھر کی تصویر اتارو اچھا لگتا ہے۔

ای ڈی اور ہمیں دیکھا تو دبوچ لیا۔ اس شام کسی کا شکار تو ہونا تھا۔ بل کے ہاتھ آجائیں

تو کیا برا ہے۔ گفتگو کا سلسلہ نکلا۔ جس میں نل فرما رہے تھے اور ہم سن رہے تھے اچانک ای ڈی نے "معاف کیجئے" کہا اور ایک طرف چلا گیا۔ ہم نے دیکھا ذرا فاصلے پر نے کھڑی تھی۔ ای ڈی اور نے کی دوستی چل رہی تھی۔ ہم اکیلے نل کا چارہ رہ گئے اچانک قدرت کو رحم آ گیا۔ اس طرف آئیڈیا ڈولتی آ گئیں۔ ہم نے آواز دے کر بلا لیا وہ شاید تھک گئی تھیں بیٹھنا چاہتی تھی اس لئے صوفے پر پھیل گئیں۔ اچانک ہم نے کلے کو لفٹ کی طرف سے آتے دیکھا اور "معاف کیجئے" کہہ کر آئیڈیا پر نل کو چھوڑ کر سرک لئے۔

....

تین ہزار سال پرانا شہر

ترکی والے ایک چیز میں مہارت رکھتے ہیں۔ جگہ جگہ پرانے شہر کھود کر نکال لیتے ہیں پھر اس کی تاریخ اور جغرافیہ بناتے ہیں بعض میں تو یونیسکو دامے درمے سخنے مدد کرتا ہے اور سیاحوں کو معلوم ہوتا ہے تو وہ استنبول بھاگے چلے آتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ترکی میں صرف ترکی بولی جاتی ہے...... ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں اس کے باوجود بھی کوئی انگریزی سے واقف نہیں بڑے سے بڑا ہوٹل انگریزی سے دور ہے بعض علاقوں میں تو بات اشاروں سے کی جاتی ہے ترکی کے دوکانداروں کو یہ بات سمجھنی چاہئے کہ جو گاہکوں سے انگریزی بول سکتا ہے سب اسی کی دکان کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ لیکن قومی کردار بھی کوئی چیز ہے۔ چاہے لاکھ نقصان ہو مگر ترکی پھر ترکی ہے...... جب سے کمال اتاترک انقلاب لائے ہیں اپنے رسم الخط کو عربی سے بدل کر لاطینی کر لیا ہے۔ ترقی پسند نوجوان جو انقرہ استنبول اور ازمیر میں رہتے ہیں اپنے سارے

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

رشتے یونانی، رومن اور عیسائیوں سے جوڑنے میں فخر سمجھتے ہیں۔

آج جس قدیم شہر کو دیکھنے جانا تھا۔ یہ ایفاسس ہے ایک پتلی سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں جو سیاحوں کو دبوچتی ہیں ان کے پاس تصویریں کتابیں اور ایک نیلے رنگ کے گول پتھر میں آنکھ بنی ہوتی ہے۔ اسے "شیطانی آنکھ" کہتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اسے گھر کے اندر لٹکا لیں تو کسی کی بری نظر نہیں لگتی جادو نہیں ہوتا۔ مراد کی کوچ کے دروازے پر اندر کی طرف ایک چھوٹی نیلی آنکھ لگی تھی۔ اس کے باوجود ہمارے ساتھ کچھ سیاح خواتین آنکھوں بالوں اور ہونٹوں سے جادو جگانے کی کوشش کرتی تھیں اور دکانوں پر لگی اشیا پر بری نظر ڈالتی تھیں۔ ترکی میں یہی سوویز کی صورت میں مہیا ہوتی ہے۔

کوچ جس جگہ رکی یہ ایک بڑا گیٹ تھا۔ مراد نے ہدایت کی اپنے کوٹ پہن لیں کیمرہ ساتھ لے لیں باقی سامان کوچ میں چھوڑ دیں۔ جب تک سیاح کوچ سے اترتے مراد اس علاقے کا ٹکٹ خرید لایا اور ہدایت کی "سامنے بورڈ کے پاس انتظار کریں" سب لوگ بورڈ کے پاس جمع ہو گئے تو وہ کوٹ کے کالر اٹھا کر آیا اور بورڈ کے ذریعے سمجھانے لگا ہماری پشت پر پتھر کے ستون سیڑھیاں، دیواریں اور ٹوٹے ہوئے راستے تھے۔ یہ ایک قدیم شہر کے کھنڈرات تھے۔

یہ شہر 20 ہزار قبل مسیح میں بسایا گیا تھا۔ دونوں طرف دو بڑے پہاڑ ہیں۔ یہ شہر دریا کے کنارے تھا۔ یونانی بادشاہ اس جگہ لوگوں کو بسانا چاہتا تھا۔ لوگ زیادہ تر ماہی گیری کرتے تھے اس لئے دریا کے پاس رہنا چاہتے تھے۔ دوسری جگہ آنے پر آمادہ نہ ہوئے تو بادشاہ نے ان کے گھروں میں دریا کا پانی بھر دیا۔ لہٰذا وہ مجبور ہو کر یہاں رہے۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک پرانا قبرستان تھا۔ لوگ یہاں نہیں رہنا چاہتے تھے لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات۔ ہر دور میں عوام، عوام ہی رہتی ہے۔

پتھروں کے راستے سے ہوتے ایک میدان میں پہنچے جہاں ٹوٹے ستون پڑے تھے۔ مراد نے بتایا یہاں شہر کی مارکیٹ تھی۔ روزمرہ کی اشیا کے علاوہ نوادرات اور فنون لطیفہ کی چیزیں بھی فروخت کی جاتی تھیں۔ سوداگر دور دور سے آتے تھے۔ ان دکانوں میں اشیا کی قیمتیں مقرر تھیں جنہیں چیک کرنے کے لئے حاکم مقرر تھے۔ زیادہ قیمت۔ کم تولنے اور ملاوٹ پر سزا تھی۔ ایسا محسوس ہوا ہم اس دور کے زندہ انسانوں کا کوئی شاپنگ سینٹر دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے کہ

انسان چاہے قبل مسیح کا ہو یا اکیسویں صدی سے تعلق رکھتا ہو..... اس کا ذہن اور مزاج تبدیل نہیں ہوا۔

مارکیٹ کے بعد چند سیڑھیاں چڑھ کر شہر میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹا اسٹیڈیم تھا۔ جس میں شہر کے مشاورتی کونسل کے ارکان صلاح و مشورے کرتے تھے اسٹیڈیم کے بیچ میں جگہ تھی جہاں موسیقار دھن بجاتے رہتے تھے۔ ان ممبران کی تعداد 450 تھی اور شہر کی آبادی 25 ہزار۔ اسٹیڈیم میں مشاورت کے دوران میوزک کے بندوبست سے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ حکمران ہر دور میں بانسری بجاتا ہے اور عوام کے مکانوں میں آگ لگتی ہے۔ اسٹیڈیم کی سیٹوں پر اس وقت جاپانی اور کورین لڑکیاں اور مرد بیٹھے تھے۔ امریکہ کو معلوم ہوا کہ یہ قومیں ماضی کی مشاورتی سیٹوں پر بیٹھنے کے قابل ہو گئی ہیں تو فکر مند ہو جائے۔ یہ اچھا شگون نہیں اور نیو آرڈر کے قطعاً خلاف۔

مشاورتی کونسل کے اسٹیڈیم کے پاس چرچ تھا۔ پادریوں کی حکومت تھی۔ وہ مشورہ سنتے اور وہی کرتے ہوں گے جو ان کا دل چاہتا ہوگا۔ یہاں سنگ مرمر کے آدھے پورے ادھورے گرے ہوئے مجسمے ہیں۔ مشاورتی کونسل کے سامنے سے ایک سنگ مرمر کی راہداری دور تک چلی جاتی ہے اس پر چرچ ہے۔ ایک قربان گاہ ہے۔ بعض مجسموں میں سینگوں والے مینڈھے دکھائے گئے ہیں جنہیں دیوتا پکڑے کھڑے ہیں۔ بعض میں قربانی کی جا رہی ہے۔ غریب مینڈھے اور دنبے اپنا خون بہا کر دیوتاؤں کو قبل مسیح سے خوش کر رہے ہیں اور اچھے شگونوں کی خوشخبری دے رہے ہیں۔ غم ہو یا خوشی۔ انہی معصوموں کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے اس شہر میں پہلے یونانی آئے اور خوب میلہ رہا۔ پھر رومن دندناتے آئے اور یونانیوں کو مٹا دیا اس کے بعد عیسائی آئے اور وقت گزرتا گیا۔ اور اب ہم آئے تھے لیکن چند گھنٹوں کے لئے۔

مراد ایک ایسے راستے پر لے آیا تھا جو بہت دور جا رہا تھا۔ خاصہ چوڑا تھا اور سنگ مرمر سے بنا تھا۔ حالانکہ پتھر ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن انہیں سیمنٹ سے جوڑا گیا تھا اونچے نیچے اس لئے رکھے تھے کہ وہ اصلی نظر آئیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے وہ سیاحوں کو ٹھوکریں کھانے کی نیت سے زیادہ بنائے گئے ہیں۔ مراد ہر جملے کے بعد کہتا تھا "اپنے قدموں کا خیال رکھیں" اب اگر نیچے دیکھیں تو آس پاس کا منظر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہاں سنگ مرمر کی وجہ سے روشنی

پھیل رہی تھی مراد ہم لوگوں کو انتہائی خوش نصیب سمجھ رہا تھا کہ آج آسمان صاف ہے اور دھوپ نکلی ہے۔ ورنہ سیاح سکڑتے اور ان کے دانت بجتے جاتے ہیں ہم اس قسم کی تفریح چاہے وہ کتنی ہی تعلیمی اور معلوماتی ہو پسند نہیں کرتے جس میں خطرہ ہو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ . زندہ رہے..... سردی سے بچ نکلے تو پھر آجائیں گے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ایک ٹوٹے پھوٹے پرانے شہر کو دیکھنے کے لئے سردی سے ٹھٹھر کر جان دے دیں۔

چند سیڑھیاں اتر کر چوڑا سنگ مرمر کا راستہ تھا۔ اس کے دونوں طرف مجسمے لگے تھے۔ لیکن ایسا صرف نشان تھا۔ دائیں ہاتھ پر ایک مجسمہ کھڑا تھا جسے سیمنٹ سے جوڑا گیا تھا۔ اس کا سر نہیں تھا۔ یہ ایک خاتون ڈاکٹر تھیں جو ملیریا کا علاج کرتی تھیں۔ ایک دن خود ملیریا میں مرگئیں۔ ان کے ایک رشتے دار نے یہ مجسمہ بنوایا ویسے روایت یہ تھی کہ یہاں زندہ لوگوں کے مجسمے ہوتے تھے جن لوگوں نے کوئی نمایاں کام کیا ہو خدمت انجام دی ہو تو ان کی زندگی میں ستائش کی جاتی تھی۔ تاکہ جب وہ اس راستے سے نکلیں خوشی محسوس کریں۔ بعد میں یہ سلسلہ ختم ہوا اور اچھا ہوا ورنہ اس دور کے حکمران ہر طرف اپنے مجسمے لگوا لیتے کیونکہ اپنے خیال میں وہ ملک اور قوم کی اتنی خدمت کرتے ہیں کہ صدیوں تک یاد رکھے جائیں۔ یہ الگ بات کہ اقتدار سے محروم ہونے کے دوسرے دن سے ان کا احتساب شروع ہوجاتا ہے۔ بات تھانے کچہری سے جیل تک جاتی ہے... وغیرہ وغیرہ......

اسی راستے پر ایک بڑا حوض بنا تھا۔ جہاں پانی جمع کیا جاتا تھا عوام کے لئے.... یہ پہاڑوں کے چشموں سے آتا تھا اور خاصہ صحت مند تھا۔ اس کے بعد حمام آئے۔ انہیں دیکھنے کے لئے چند سیڑھیاں پھر دیواروں کے درمیان میں جگہ اور غسل خانے جس میں یونانیوں کے زمانے میں خواتین و حضرات ایک ساتھ نہاتے تھے رومن نے خواتین کو الگ کر دیا۔ ہیومن رائٹس والی انجمنوں نے غالباً احتجاج کیا ہوگا۔ عورتوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جارہا تھا۔

یونانی پانی گرم کر کے حمام میں لاتے اور غسل کرتے۔ رومن نے اس میں جدت پیدا کی وہ فرش کے نیچے آگ جلاتے یہ اینٹوں کا بنا ہوتا اس پر سنگ مرمر لگاتے۔ تو پانی اس کی حدت سے گرم ہوجاتا اور بہتا ہوا مطلوبہ جگہ پہنچ جاتا۔ یہ تمام رئیس لوگوں کے ہوتے اور سب ایک ساتھ نہاتے۔ اس دن سے یہ محاورہ مشہور ہے.... ''ایک حمام میں سب ننگے۔''

غریبوں کے نہانے کا کوئی نظام نظر نہیں آیا۔ شاید انہیں اس قسم کی حاجت نہ ہو ویسے بھی اس طرح نہانا ایک عیاشی محسوس ہوتی ہے۔ .. اور عوام کو ان سے دور رکھنا چاہئے تاکہ وہ اپنی اوقات میں رہیں اور رئیسوں کی برابری نہ کرنے پائیں۔ حمام کے بعد واش روم دکھانے کا اعلان کیا گیا۔ بھلا اس میں کیا دیکھنے کی چیز؟ لیکن مراد کا اصرار تھا اس لئے اندر چلے گئے۔ اس میں لائن سے کموڈ بنے تھے۔ اس کے آگے ایک گہری نالی تھی۔ جس میں پانی تیز رفتار سے بہتا رہتا تھا جو ضرورت کے وقت استعمال کیا جاسکتا تھا۔ کموڈ کے نیچے بھی پانی مسلسل جاری رہتا تھا۔ کموڈ کے سامنے ایک جگہ تھی جہاں میوزک بجانے والے کھڑے موسیقی کی تانیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ رئیس لوگ ایک ساتھ بیٹھتے اور سیاسی اور معاشی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ یہ ان کی سوشل ''بیٹھک'' ہوتی تھی۔ یہاں بھی غریبوں کا کوئی انتظام نظر نہیں آتا۔ یعنی وہ جائیں بھاڑ میں۔ حکومت نے ہر چیز کا ٹھیکہ تو نہیں لیا۔ کچھ خود بھی کریں۔ باتھ روم اور واش روم سے باہر نکل کر پھر سنگ مرمر کے راستے پر آگئے۔ ایک جگہ ایک خاتون مختصر لباس پہنے ہاتھ میں پھول لئے ہوا میں اڑ رہی تھیں مراد نے تعارف کرایا یہ فتح کی دیوی ''نائکے'' تھیں جس کی ہر بادشاہ کو ضرورت ہوتی ہے۔ عوام بھی یہی چاہتے ہیں ورنہ جنگ میں شکست کے بعد تو زن بچہ کولہو تمہی کا پلو لیا جاتا ہے۔ مراد کا کہنا تھا اسپورٹس کے جوتے نائک اسی کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ اس میں کیا برا ہے۔ دیوی کے نام پر رکھا جاتا تو خوش قسمتی کی دلیل ہے۔ ان کی ایک ہمشیرہ بھی ہیں ''نائکے'' ان کا مجسمہ بھی ایک ٹوٹی ہوئی محراب میں لگا تھا، سر زیادہ نمایاں تھا یہ خوش قسمتی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے سر پر گھنگھر والے بال تھے مراد نے بتایا یہ دراصل سانپ ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورو تو انسان پتھر کا ہو جاتا ہے۔ ہم نے سب کی آنکھ بچا کر خوب گھورا کچھ بھی نہ ہوا۔ آدمی کے آدمی ہی رہے۔ حالانکہ ہمارا خیال تھا اگر پتھر کے بن جائیں۔ وہیں رہ جائیں گے لوگ سمجھیں گے یونانی یا رومن تھے۔ کوئی بڑا کام کیا ہوگا۔ خدمت کے صلے میں مجسمہ بنا دیا ہے۔ ایک دنیا آ کر دیکھتی تو ایفسس میں ٹوٹے پتھر گرتے مینار اور ستون تک یوں دیکھے جاتے ہیں جیسے کوئی چاند چہرہ ستارہ آنکھیں دیکھے۔ سرو قد رخوش ادا کو گھورے۔

مراد نے بتایا نائکے جوا کھیلنے والوں کے درمیان بے حد مشہور ہے۔ ضرور ہوگی..... اسے امریکہ بھجوا دیں۔ وہاں سب جوا کھیلتے ہیں۔ اگر کبھی ہم نے لاٹری کا ٹکٹ لیا تو نائکے کو یاد کریں

کے۔ اچھا ناٹکے چلتے ہیں تم اپنے سر پر سانپ بٹھائے رکھو اور یہ افواہ اڑائے رکھو کہ کوئی تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ گھورے ڈرتا رہے۔ ہم آگے بڑھے راستہ سیدھے ہاتھ مڑ گیا۔ سامنے ایک عالی شان لائبریری کی عمارت تھی جس کی ایک منزل باقی تھی دوسرے کے ستون کھڑے تھے۔ یونانی اور رومن کے زمانے میں یہاں علم و ادب کی کتابیں تھیں جن سے شہر کے لوگ فائدہ اٹھاتے تھے۔ آثار کہہ رہے تھے عمارت عظیم تھی۔ دس منٹ کے لئے اجازت دی گئی۔ عمارت کو ہاتھ لگا کر آ گئیں۔ ہم کسی پرانی عمارت، مقبرے یا ستون کو بغیر ضرورت ہاتھ نہیں لگاتے۔ ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے۔

مراد نے تجویز پیش کی سب اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گروپ فوٹو بن جائے۔ ایک اجنبی شخص فوراً کیمرہ لے کر آگے آ گیا یہ ہوٹل ''اداکولے'' کا آدمی تھا اور بہت دیر سے سب کی تصویریں بنا رہا تھا۔ ایک گروپ کھینچ لیا گیا۔ اس کے بعد مراد نے اشارے میں بتایا لائبریری کے سامنے ناچنے گانے والیوں کا بازار تھا۔ اس کے داخلے کے دروازے پر ایک پتھر پر الٹا پاؤں بنا ہے...... اس کا مطلب ہے غلط کام کے لئے جا رہے ہو۔ اس بازار اور لائبریری کے درمیان ایک سرنگ تھی تاکہ رئیس کسی کی نظروں میں آئے بغیر اس طرف چپکے سے آ سکیں۔ اچھا انتظام تھا۔ اکیسویں صدی میں اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ آخر رئیسوں کو عزت بچانی ضروری ہے۔ بازار کے شروع میں حمام تھا۔ جس میں نہانا ضروری تھا۔ گانے ناچنے والیوں کے بازار میں صاف ستھرا ہو کر جانا لازم تھا۔ وہاں سے واپسی کی کوئی شرط نہیں تھی۔

مراد نے کہا میری والدہ نے ایسی جگہ جانے کو منع کیا ہے۔ اس لئے آپ لوگ دیکھ آئیں۔ میں باہر بیٹھا ہوں۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بنانے لگا اسے چھوڑ کر نہ گئے وہاں ایک گلی تھی جس میں دونوں طرف کمرے تھے اور ہر شخص کو افسوس تھا وہ خالی تھے۔ اچانک ایک کمرے کی چوکھٹ پر آسٹریلیا کی لی کھڑی ہو گئی شیخ نے ہم سے تصویر کھینچنے کی درخواست کی اور جب ہم نے کیمرے کا بٹن دبایا تو شیخ نے کچھ نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے جیسے ناچنے والی کو رقم دے رہا ہے۔ آس پاس کھڑے لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ ہم نے شیخ کے ذوق پر افسوس کیا۔ گانے ناچنے والی بھی منتخب کیں تو خاصی گئی گزری۔

اس جگہ سے نکلے تو پھر سنگ مرمر کے راستے پر چل پڑے۔ مراد نے دائیں طرف ایک پتھر کی طرف سب کی توجہ دلائی۔ اس پر بھدا سا ایک دل اُس کے برابر عورت کی تصویر بایاں پاؤں اور ایک گول سوراخ بنا تھا۔ مراد بتانے لگا۔ سوراخ کا مطلب ہے اس میں سکہ ڈالو تو دل یعنی محبت الٹے پاؤں کا کھیل ہے۔ اس کے خیال میں یونانیوں کے زمانے میں بھی اشتہاری صنعت موجود تھی اور یہ اس کا ایک نمونہ تھا۔ ہر دور میں دل جیتنے کے لئے سونے چاندی کی ضرورت رہی ہے۔ یہ اصول قبل مسیح سے بعد از مسیح اور جارج واشنگٹن سے جارج بش تک رائج ہے۔ سیاح متاثر ہو رہے تھے۔ سفر پھر شروع ہوا اور اچھا خاصہ راستہ چھوڑ کر مراد بائیں طرف سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور اوپر لگی ریلنگ کے پاس پہنچ گیا وہاں کچھ دکھانا تھا۔ لوگ اوپر چڑھنے لگے پہلے تو خیال آیا ہم نے بہت دیکھ لیا ہے اوپر نہ جائیں لیکن سب ہی جانے لگے تو موسم سیاحت نبھانے کے لئے ہم نے بھی سیڑھیاں چڑھ کر ریلنگ کا قرب حاصل کیا۔ مراد ایک بہتر بڑا اسٹیڈیم دکھا رہا تھا۔ دور سے سب چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ اچانک وہ بائیں طرف گیا اور نیچے جاتی ہوئی شکستہ سیڑھی۔ اکھڑی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کے پیچھے سیاح۔ یہ سیڑھیاں مشکل سے 12 یا 14 ہوں گی۔ لیکن دونوں طرف سے کھلی بائیں طرف ایک گہرا اسٹیڈیم اور دائیں طرف نیچے ٹوٹے ہوئے ستون اور پتھر پڑے تھے۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو محسوس ہوا وہ ہل رہی ہے اور فوراً دوسری سیڑھی پر قدم نہیں رکھا تو ہم یونانی تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ گھبرا کر دوسری پر قدم رکھا تو وہ لرز رہی تھی۔ تیسری کا ایک ننھا پتھر ہمارے پاؤں کی دھاک سے بائیں طرف گرا۔ اس کے بعد عالم بے ہوشی میں سیڑھیاں اتریں تو زمین نزدیک آنے لگی اور پھر جب قدم گھاس لگی زمین پر پڑا تو یوں محسوس ہوا ہم اس کے لئے صدیوں سے بے چین تھے۔ وہ اتنی اچھی لگی جی چاہا ایک سجدہ شکر بجا لائیں ''رب تو نے زمین بنا کر کتنا اچھا کیا۔''

لاتعداد اوپر سے نیچے آتی سیڑھیوں کے سامنے مراد کھڑا تھا۔ یہ عظیم الشان اسٹیڈیم تھا جس میں ایک وقت میں 24 ہزار افراد بیٹھ سکتے تھے۔ جہاں ہم کھڑے تھے اس جگہ کے دائیں بائیں دو تاریک راستے تھے۔ ماضی میں یہاں سے خونخوار شیر اور چیتے اندر لائے جاتے تھے۔ جن سے انسانوں کو لڑایا جاتا تھا۔ سامنے جو اسٹیڈیم کی سیڑھیاں تھیں وہ اونچی بنائی گئی تھیں تاکہ جانور تماشیوں پر حملہ نہ کر سکیں۔ ہمیں دائیں طرف اپنی پشت پر وہ شکستہ لرزتا سیڑھیوں سے بھرا زینہ نظر آ رہا تھا جس سے واپسی تھی۔ مراد جو کچھ بتا رہا تھا اس کی آواز تو آ رہی تھی لیکن سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا۔ اس اسٹیڈیم کا ذکر بائبل میں ہے۔ ضرور ہوگا اور اگر ان سیڑھیوں سے واپسی میں چڑھتے ہوئے دائیں بائیں گر گئے تو ہماری زندگی کی کتاب کے آخری صفحے پر بھی اس اسٹیڈیم کا ذکر ہوگا۔ ایک بار تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سیڑھیاں نہ ہوں مگر مچھ کے دانت ہوں اور منہ کھولے ہماری طرف آ رہا ہے۔

اسٹیڈیم کی تاریخ اس کا جغرافیہ سب سیڑھیوں کے خوف کی نذر ہوگیا۔ مراد خونخوار جانوروں کی انسانوں سے جنگ کی داستانیں سنا کر مزید خوفزدہ کر رہا تھا۔ اس قسم کے اسٹیڈیم ہم نے روم میں دیکھے تھے۔ کیونکہ رومن ترکی میں رہے اس لئے وہی کچھ یہاں بھی تھا۔

مراد نے غالباً محسوس کر لیا ہم ڈر رہے ہیں اس لئے مزید خوفزدہ کرنے کے لئے بائیں طرف کے اندھیرے راستے میں گھس گیا اور سیاح اس کے پیچھے چل پڑے یہی وہ جگہ تھی جہاں خونخوار درندے انسانوں کو شکار کرنے کے لئے لائے جاتے تھے۔ یہ بات مان لی کہ سارے قصے کو صدیاں گزر گئیں۔ لیکن اگر کوئی بچ رہا۔ ہو تو...... غار زیادہ بڑا نہیں تھا اور نہ لمبا۔ اس لئے فوراً روشنی میں آ گئے اور سامنے بہت سی سیڑھیاں سنگ مرمر کے راستے پر اترتی نظر آئیں۔ ان کے دونوں طرف گہرائی نہیں تھی۔ ہم نے بسم اللہ کر کے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو ایک مہربان ہاتھ نے ہمارا بایاں بازو تھام لیا۔ اب جو دیکھا تو فلوریڈا کی سیلیا تھیں۔ بھورے بالوں اور زیر لب مسکرانے والی......

"شکریہ ......" ہم نے کہا...... اور اس سہارے نے جو ڈھارس دی وہ صرف ہم جانتے ہیں۔ بہت سی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے تو سنگ مرمر پر کوئلے سے مراد پھول اور ایک دائرہ بنا کر سمجھا رہا تھا کہ یونان اور رومن کے زمانے میں عیسائیوں پر سخت پابندی تھی۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کو اپنی شناخت کرانے کے لئے خاص قسم کے نشان استعمال کرتے تھے گول دائرے میں کراس کی طرح کی پنکھڑیاں بناتے جب وہ پہچانے جاتے دوسرے نشان اختیار کر لیتے سب جھک کر دیکھنے لگے اس کے بعد سنگ مرمر کے راستے پر چل کر باہر نکلے تو کوچ کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر جو سکون کا سانس لیا اس کی راحت کوئی ہم سے پوچھے۔

****

مسلمانوں کا لامذہب ترکی

چھٹی صدی عیسوی میں ترک ایک خانہ بدوش قوم تھی اور وسط ایشیا میں آبادیوں پر حملہ کرتی رہتی تھی۔ دریا، کہسار، جنگل جنگل گھومتی ہوگی کیا منظر اور کیسے نظارے دیکھتی ہوگی۔ اس قوم میں کچھ باذوق ضرور ہوں گے۔ سفر کے بعد سفرنامہ لکھنے کی طرف توجہ بھی دی ہوگی۔ افسوس اس دور کے سفرناموں کے بارے میں تاریخ خاموش ہے اس لئے ہم بھی چپ رہتے ہیں۔

چھٹی صدی گزرنے نہیں پائی تھی کہ ترک قوم اپنے سفرنامہ نگاروں سے تنگ آ گئی اور ایک ہی ترکیب سمجھ میں آئی کہ سفر ترک کیا جائے۔ ایک جگہ رہنے لگیں تو سفرنامے کیسے لکھے جائیں گے...... ان دنوں اکیلے دوکیلے نکلنے کا رواج تھا۔ نہ موقع نہ دستور۔ اس لئے جب ترکوں نے سفر ترک کیا اور ایک سرسبز چراگاہ کے پاس ڈیرا ڈال دیا۔ تو ان میں سے جو طاقتور تھا اس نے حکومت بنالی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس ہوتی ہے۔ اب جو حکومت

بنی وہ چین اور منگولیہ سے بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا بانی یومین تھا۔ پھر اس کے بیٹے اقتدار میں آئے۔ بادشاہت میں یہی اچھی بات ہے کہ باپ کے بعد بیٹا حکومت حاصل کرتا ہے چاہے کیسا ہی نااہل ہو۔ یومین کے بیٹوں نے الگ الگ حکومت قائم کی اور شیر بکری کو ایک گھاٹ پانی پلایا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اس قبیلے کے سرداروں نے اپنا لقب خاقان رکھا۔

عرب اشاعت اسلام کے لئے اِدھر اُدھر پھیلے تو ان کے تعلقات ترکوں سے ہوئے اور وہ مسلمان ہونے لگے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ترکوں کو مسلمان بنانے کی کوشش شروع ہوئیں۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں بڑی تعداد میں ترک مسلمان ہو کر فوج میں شامل ہوئے جب دولت عباسیہ کا زوال ہونے لگا، بغداد کا مرکز کمزور ہوگیا تو مختلف علاقوں کے گورنروں نے اپنے علاقوں میں حکومتیں قائم کرلیں۔ ترکوں کے ایک گروہ نے خراسان میں دولت سلجوقیہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے سوچا جب سب حکومت بنا رہے ہیں تو ہم کیوں پیچھے رہیں۔ بہتی گنگا میں ہم بھی نہالیں۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ سلجوقیہ حکومت کے بانی سلجوق نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کی وفات کے بعد حکومت طغرل بیگ کو ملی جس نے آس پاس کے ملکوں پر اپنی طاقت سے قبضہ کرلیا۔ محمود غزنوی اس کے ارادوں کو بھانپ گیا اور طغرل بیگ سے جنگ کی۔ لیکن مقابلہ نہ کرسکا۔ عباسی خلیفہ قائم باللہ اور برسر اقتدار ترک سرداروں نے آل بویہ قبیلے سے بچنے اور خلافت کو قائم رکھنے کے لئے طغرل بیگ کو بلایا۔ جس نے اپنی طاقت سے اہل بویہ کو کچل دیا۔ خلیفہ نے خوش ہو کر طغرل بیگ کو "سلطان شرق و غرب" کا خطاب دیا۔ یوں خلیفہ نے اسے سلطان تسلیم کرلیا۔

طغرل بیگ کا ایک سردار باغی ہوگیا اور اس نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ لیکن شہر کے قریب ایک جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بیٹے سلیمان نے نائیا شہر پر قبضہ کیا اور نئی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ایک صلیبی جنگ میں نائیا شہر ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس پر بازنطیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اقتدار تو دھوپ چھاؤں ہے ایک کے ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ جاتا ہے اور اکثر جان بھی لے جاتا ہے۔ سلیمان کے پاس بہت تھوڑا علاقہ تھا۔ ادھر سلاجقہ کی حالت بھی نازک تھی۔ لیکن حکومت چلتی رہی۔ اسی خاندان کے ایک بادشاہ مسعود ارسلانی نے حکومت کو سنبھالا دیا۔ قونیہ شہر

کو پایہ تخت بنایا۔ اس کے جانشین اور ارسلان دوئم نے حکومت کو بڑھانے کے لئے دشمنوں کو شکست دی پھر زوال کی کہانی شروع ہوئی۔ تاتاری طوفان ایشیاء کوچک کی سرحد تک پہنچ گئے۔ حکومت کو ختم کردیا اور نام کے لئے ان کی اولادوں کو تخت پر بٹھا دیا۔ اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھا اہل سلجوق کے لوگوں میں ابھی بہادروں کا خون گردش کر رہا تھا اس لئے مصر سے مدد مانگی۔ وہ بھی تیار بیٹھے تھے جھٹ آگئے۔ تاتاریوں کو وقتی طور سے شکست ہوگئی۔ اب آنکھ مچولی شروع ہوئی تاتاری جیت جاتے تو سلجوق حکومت دربار تک رہ جاتی اور تاتاری میدان جنگ سے بھاگ لیتے تو سلجوق مضبوط ہوجاتے۔ آخر تاتاری کمزور ہوئے اور جہاں جہاں بہادر سردار تھے انہوں نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ اچانک چنگیز خان طوفان بن کر اٹھا اور ترک سردار پناہ کے لئے مختلف علاقوں کی طرف بھاگے۔ ان میں طغرل بیگ کا قبیلہ بھی تھا جو اپنے سردار سلیمان شاہ کی سرکردگی میں بھٹکتا خراسان سے شام جا رہا تھا۔ راستے میں دریائے فرات عبور کرتا سلیمان شاہ ڈوب گیا۔ ویسے بھی غریب کا اقتدار کا ستارہ پہلے ہی ڈوب چکا تھا۔ دریائے فرات نے موقع غنیمت جانا اور شاہ کو دبوچ لیا۔ قصہ تمام ہوا۔ سردار کی موت سے قبیلے کا بیشتر حصہ منتشر ہوگیا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا نکل لیا۔ جو رہ گئے وہ طغرل بیگ اور اس کے بھائی کے ساتھ سلطان علاؤالدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہوگئے۔ یہ چار سو بیس گھرانے سلطان کے پاس پناہ لینے جا رہے تھے۔ راستے میں انگورہ کے قریب طغرل بیگ کو دو فوجیں لڑتی نظر آئیں۔ ایک کمزور اور دوسرا قوی تھا۔ طغرل بیگ بہادر سردار تھا وہ کمزور فوج کی طرف سے لڑنے لگا اور مضبوط فوج بھاگ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جس فریق کی اس نے مدد کی تھی وہ سلطان علاؤالدین سلجوقی کی فوج تھی اور تاتاریوں سے مقابلہ تھا قدرت مہربان ہوگئی۔ اس کارنامے پر سلطان علاؤالدین سلجوقی نے طغرل بیگ کو انعام میں سغوت کا زرخیز علاقہ اور شہر دے دیا۔ یہ دریائے سقاریہ کے کنارے واقع تھا اور یہ قبیلہ وہیں رہنے لگا۔ یہ شہر اکثر دشمنوں کی زد میں رہتا اور یہ مار کر بھگا دیتے اور اس کی بہادری اور قوت کی دھاک بیٹھ گئی اور بہت سے ترک قبائل اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ یہ بات سلطان علاؤالدین کو پریشان کرسکتی تھی۔ لیکن جو حالات تھے اس میں دشمن سے نمٹنے کے لئے طغرل بیگ جیسے بہادر کی ضرورت تھی۔ سلطان نے ذہانت سے کام لیا اور طغرل کو مزید انعام و اکرام دیئے اس بہادر سردار نے تاتاریوں اور بازنطیوں کو کئی بار شکست دی اور

مزید جاگیریں حاصل کیں۔

سلطان علاؤ الدین کے جھنڈے کا نشان ہلال تھا۔ طغرل اس کا نائب سلطنت تھا۔ اس نے وہی نشان رکھا جو آج تک ترکی کا قومی نشان ہے۔

طغرل بیگ کے بعد اس کا بڑا بیٹا عثمان نائب سلطنت ہوا۔ باپ کی طرح بیٹا بھی سلطان علاؤ الدین سلجوق کا وفادار رہا اور اپنی فتوحات سے سلطان کی شان و شوکت میں اضافہ کرتا رہا۔ سلطان بزور شمشیر حاصل ہونے والے علاقے اسے جاگیر میں دے دیتا۔ تیز بک کا خطاب بھی دیا۔ اپنا سکہ جاری اور نام خطبے میں شامل کرنے کی اجازت بھی دی۔ اس طرح سلطان کے تمام اختیارات عثمان کو حاصل ہو گئے۔

چند سال بعد تاتاریوں نے حملہ کیا۔ جنگ کے دوران سلطان علاؤ الدین سلجوقی مارا گیا اور اس کے بیٹے کو بھی قتل کر دیا گیا۔ سلجوق حکومت ختم ہوگئی اور دولت عثمانیہ کا آغاز ہوا۔ یہ 1288ء کا ذکر ہے۔ عثمان اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لقب استعمال نہیں کرتا تھا۔ صرف امیر کہلواتا تھا۔

عثمانی خلیفہ نے 1288ء سے 1923ء تک حکومت کی یہ 635 سال کی داستان ہے۔ ایک روشن تاریخ اور 28 بادشاہوں کے کارنامے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری سلطان عبدالمجید ثانی تخت سے دستبردار کر دیئے گئے اور کمال اتاترک نے ترکی کو لادینی جمہوریت قرار دیا۔

دولت عثمانیہ کا دور علم و ہنر، مذہب وملت کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس میں ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جو عبرت ناک ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کا چوتھا بادشاہ بایزید اول ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس نے آس پاس کی 76 مملکتوں کو ترکی کا محکوم بنا دیا تھا۔ اب تک دولت عثمانیہ کے بادشاہ اپنے لئے ''فرماں روا'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ بایزید نے مصر کے عباسی خلیفہ کی اجازت سے ''سلطان'' کا لقب اختیار کیا۔ اس وقت تک اسلامی دنیا کا خلیفہ عباسی کی مذہبی حکمرانی تسلیم کی جاتی تھی۔ بایزید کو تاتاریوں سے لڑنا پڑا اور تیمور سے شکست کھا کر اس کی قید میں چلا گیا۔ تیمور نے اسے عزت و احترام دیا لیکن بایزید نے ایک دن فرار ہونے کی کوشش کی۔ تیمور نے سزا کے طور پر ایک لوہے کے پنجرے میں قید کر دیا اور جب یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتے بایزید اول کے پنجرے پر کپڑا ڈال کر لے جاتے بایزید یہ ذلت گوارہ نہ کر سکا اور آٹھ ماہ بعد

مر گیا۔ جلیل القدر سلطان کا انجام عبرت انگیز تھا۔ بظاہر عثمانی دور ختم ہو گیا تھا لیکن بایزید کا دوسرا بیٹا تخت پر بیٹھا تو حالات نے پھر کروٹ لی اور عثمانی سلطنت کے قدم جمنے لگے۔

ساتویں سلطان محمد ثانی تھا جسے فاتح کا خطاب ملا۔ اس نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ سلطان کے دور میں فتوحات کا دور شروع ہوا۔ یونان، سرویا، بوسنیا، معدیا، کرمانیہ، لایزوں، سینوپ، یونانی مجمع الجزائر، کریمیا، ولاجیا، البانیہ، ہرزیگو نیا، وینس پر قبضہ ہوا۔ اٹلی کے شہر اور بندرگاہ اوٹرانٹر فتح ہوا۔

آٹھویں خلیفہ بایزید ثانی نے اسپین سے 15 لاکھ یہودیوں کو اپنے ملک میں پناہ دی یہ وہ زمانہ تھا جب اسپین سے مسلمان اور عیسائیوں کو نکال رہے تھے۔ مسلمانوں کو ترکی میں پناہ نہیں ملی۔

ایک موقع پر یہودیوں نے یروشلم سے عیسائیوں کو نکالا تو ترکی نے انہیں پناہ دی اور وہاں سے ترک مسلمان اپنے ملک میں بلا لئے۔

سلیم اول سلطنت عثمانیہ کا 9 واں سلطان تھا۔ جسے خادمین حرمین الشریفین کی خدمت کا شرف حاصل ہوا۔ آخری عباسی خلیفہ المتوکل قاہرہ میں شان و شوکت سے سلاطین مملوک کے زیر سایہ رہتا تھا۔ اس نے خلافت کے تمام اختیارات سلیم اول کو دے دیئے۔ مقامات مقدسہ کی کنجیاں نیز بعض تبرکات جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، علم، چادر، بطور سند خلافت سلیم اول کے حوالے کیں۔ اس تاریخ سے سلاطین عثمانیہ ''خلیفہ'' کے لقب سے پکارے جانے لگے۔

سلطان اعظم ثانی 10 ویں خلیفہ کے زمانے میں بلغراد، ہنگری، ویانا اور اسٹاریا فتح ہوا۔ تیونس پر ترکی حکومت قائم ہوئی۔

گیارہویں خلیفہ سلیم ثانی کے دور میں قبرص فتح ہوا۔ ترکی کی سرحدیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔

ڈیڑھ سو سال تک احکامات خداوندی اور شریعت محمدیؐ پر عمل کرنے سے جو انصاف اور مساوات قائم ہوا تھا۔ اس میں کمی ہونے لگی۔ سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ ان کی وجہ سے بعض ملکوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ کچھ پر طاقتور قومیں جھپٹ پڑیں۔ انگلستان نے

مصر، فرانس نے تیونس، الجزائر اور اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔

ترک صدیوں سے لڑتے لڑتے تھک گئے تھے۔ وہ امن و سکون سے رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے اپنے سب سے بڑے دشمن روس سے معاہدۂ دوستی کرنا چاہتے تھے فرانس، انگلستان اور یونان سے مصلحت چاہتے تھے۔ لیکن دشمن کچھ اور چاہتا تھا۔ 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ ترکی غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا لیکن جرمنی اور روس کے درمیان جیتا تھا روس نے اتحادیوں سے مل کر اس لئے جنگ شروع کی تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر لیں۔ مجبوراً ترکی کو مخالف قوتوں کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ جرمنی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اتحادی ترکی کو اپنے ساتھ یوں بھی شامل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ترکی کے عوام بھی روس کے دشمن جرمنی کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا فیصلہ ہوا ترکی روس کے خلاف لڑے گا۔ برطانیہ نے اس کی اطلاع ملتے ہی ترکی کے خریدے ہوئے بحری جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ جنگ شروع ہوئی تو ترکی نے آبنائے فاسفورس اور درہ دانیال دشمن کے جہازوں کے لئے بند کر دیا۔ اتحادیوں نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ فاسفورس کے ساحل پر 50 ہزار فوجی مارے گئے۔ اس جگہ انور کمال پاشا کی کمان تھی۔ اس نے غیر معمولی ذہانت اور بہادری سے اپنی فوجوں کو لڑایا اور اتحادی اس محاذ پر شکست کھا گئے۔ اتحادی فوجیوں کے ایک لاکھ بارہ ہزار فوجی مر گئے یا زخمی ہوئے۔ ترکی کا بھی جانی نقصان ہوا۔ لیکن دنیا پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ ترک ابھی زندہ ہیں ان کی رگوں میں گرم خون گردش کرتا ہے۔

1918ء میں حجاز، شام، عراق، عرب کے تمام علاقے ترکوں سے نکل کر اتحادیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ جرمن ہار گئے، ترکی نے اتحادیوں سے صلح کر لی۔ معاہدہ ہو گیا جس میں اتحادیوں کی شرطیں مان لی گئیں۔

اتحادیوں نے دولت عثمانیہ کی آپس میں بندر بانٹ طے کر لی تھی اور اب عمل کا وقت تھا۔ معاہدہ کے رو سے اتحادیوں کو ترکی کے کسی بھی علاقے پر قبضے کا حق تھا۔

برطانیہ کا ایک بہت بڑا بحری بیڑا چالاکی سے استنبول آیا اور بہت سی سرکاری نجی عمارتوں پر قابض ہو گیا۔ بحری افواج کی مدد سے یونان نے ازمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کا شدید ردعمل ہوا۔ اتحادی فوجیوں کے خلاف ترکوں نے گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا۔ سلطنت عثمانیہ محض کاغذ پر تھی وہ اتحادیوں کے مطالبات تسلیم کرنے کے لئے کام کر رہی تھی۔ خلیفہ وحید الدین کٹھ پتلی

بنے ہوئے تھے۔

انور کمال پاشا نے سلطان کی پالیسیوں اور معاہدے کی مخالفت کی لیکن ان کی بات نہ مانی گئی تو وہ فوج سے استعفیٰ دے کر استنبول میں چھپ کر اپنے دوستوں اور سیاست دانوں سے مشورہ کرتے رہے۔ انہوں نے کچھ تجاویز عثمانی حکومت کو دیں جو نظر انداز کر دی گئیں۔ انور کمال نے تحریک جاری رکھی جو حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ اس لئے انہیں فوج سے برطرف کر دیا گیا۔ لیکن وہ اپنی سرگرمیوں میں زیادہ تیز ہو گئے اپنے ساتھیوں کو جمع کرنے لگے۔ تحریک آزادی کے لئے ایک اخبار جاری کیا اور حکومت کو اطلاع دی کہ وہ اعلیٰ اختیار استعمال کریں گے۔ آخر بحری امور کے وزیر صالح پاشا کو انور کمال پاشا سے سمجھوتے کے لئے بھیجا گیا۔ طے یہ ہوا کہ انتخابات آزادانہ اور آزاد علاقے میں ہوں گے۔ یعنی استنبول سے باہر۔

انتخاب میں انور کمال پاشا کو ممبر چن لیا گیا اور وہ انقرہ چلے گئے جو تحریک آزادی کا مرکز بن گیا۔ تحریکیں زور پکڑ گئیں۔ ترک اپنے علاقوں کو آزاد کرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور آخر اتحادیوں کو ترکوں کے مطالبات ماننے پڑے اور ترکی جمہوریہ قرار پایا اور استنبول سے قبضہ ختم ہوا۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ خلافت کو عثمانی سلطنت میں قائم رہنے دیا جائے۔ سلطان وحید الدین کو صرف خلیفہ تسلیم کر لیا گیا، لیکن اس آخری خلیفہ نے برطانوی کمانڈر انچیف جنرل میرنگٹن سے پناہ طلب کی اور 17 نومبر 1922 کو ایک برطانوی جہاز میں استنبول سے روانہ ہو گئے۔ قومی اسمبلی نے انہیں خلافت سے ہٹا کر عبدالمجید آفندی کو خلیفۃ المسلمین مقرر کر دیا۔ لیکن مسلم ممالک نے انہیں خلیفہ تسلیم نہیں کیا۔ قومی اسمبلی نے جو شرطیں نئے خلیفہ کے لئے رکھی تھی انہوں نے اس پر بھی عمل نہیں کیا۔ بلکہ وہ رویہ اپنایا جس میں بادشاہت قائم رکھنے کا تاثر ملتا تھا۔

29 اکتوبر 1923ء کو ترکی جمہوریہ بنا دیا گیا اور 3 مارچ کو خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا تاکہ کوئی قانونی الجھن نہ رہے۔ ہندوستان میں خلافت تحریک چلی جس میں مطالبہ تھا کہ خلافت کو برقرار رکھا جائے مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا مصطفیٰ کمال پاشا کو اسمبلی نے اتاترک یعنی ''ترکوں کا باپ'' کا خطاب دیا گیا اور ملک کا پہلا صدر بنا دیا گیا۔ جس نے سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات کیں۔ ترکی کو لادینی ریاست بنا دیا۔ دینی مدارس، مذہبی عدالتوں،

وزارت مذہبی امور اوقاف ختم کر دی۔ انہوں نے ترکوں کو مسلمان کے بجائے ترک قرار دیا۔ قومیت کا جذبہ ابھارا۔

علامہ اقبال نے اسی موقع کے لیے کہا تھا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اتاترک مذہب کو سیاست سے الگ کر چکے تھے۔ لمبے چوغے اور ایسا لباس جس سے مذہبی ہونے کا اظہار ہو ممنوع قرار دیے، خانقاہوں، مسجدوں میں مذہبی تقاریب پر پابندی نافذ کر دی، لمبے چوغے والا لباس صرف امام مسجد پہن سکتا تھا۔ پیری مریدی، قبر پرستی ممنوع قرار پائی۔

خواتین کو خصوصی آزادی دی۔ انہیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرنے کا موقع دیا اور کچھ زیادہ ہی دے دیا۔ بڑے شہروں میں اس پر عمل بھی ہوا۔ استنبول میں لڑکیاں اور لڑکے شادی کے بغیر رہ سکتے ہیں۔ اسقاط حمل بھی قانونی قرار دیا گیا۔ ترکی زبان سے عربی، فارسی اور فرنچ الفاظ کو نکال دیا۔ ترکی کا رسم الخط عربی تھا۔ اسے لاطینی زبان میں لکھنے کا طریقہ شروع کیا۔ پورے ملک میں لوگ اس نئی زبان کو سیکھنے لگے۔ اسی طرح تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھ گئی۔

ترکی زبان سے ''ہی'' اور ''شی'' یعنی عورت اور مرد کے الفاظ کی جگہ نام لکھنے پڑے۔ اگر لڑکی کے آنے کا اظہار ہو تو کہیں گے ''رضیہ آ رہی ہے۔'' ''وہ آ رہی ہے'' نکال دیا گیا معاشرہ کو پوری طرح مغربی بنانے کی کوشش کی۔

ہجری سال کے بجائے ملک میں عیسوی سال رائج کیا گیا۔ ہر وہ کام کیا جس سے مغرب خوش ہو سکتا۔ لیکن افسوس یورپین کامن مارکیٹ میں اسے صرف ایسوسی ایٹ ممبر بنایا گیا۔ اس کا مطلب ہے ترکی کو مغرب نے تسلیم نہیں کیا۔

پاکستان اور ترکی کے پرانے مراسم ہیں۔ ہندوستان پر حکومت کرنے والے زیادہ تر بادشاہ ترک تھے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے ان میں بہت سی باتوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ 1951ء میں پاکستان اور ترکی کا معاہدۂ دوستی ہوا جن کے تحت اقتصادی، ثقافتی اور سماجی ترقی کے لئے دونوں برادر ملکوں کا آپس میں ‑ اد ضروری سمجھا گیا۔

جولائی 1964ء میں پاکستان کے صدر ایوب خان کی تجویز پر معاہدۂ استنبول ہوا۔ جس میں ترکی، ایران اور پاکستان شامل ہیں۔ اسے علاقائی تنظیم برائے ترقی یا آر سی ڈی کہتے ہیں جس میں ترقی سے عوام کی خوشحالی کا یقینی بنانا ہے۔ اس کے تحت بہت سے پراجیکٹ بنائے گئے۔ انقرہ میں ایک سڑک کا نام محمد علی جناح روڈ ہے اور پاکستان کا ہر شخص ترکی سے محبت کرتا ہے۔ اسی لئے ترکی کی ترقی اور تعمیر کا خواہش مند ہے۔

****

مقامات دیکھے گا۔ رات کو ہماری جب آنکھ کھلتی اسے جاگتا پاتے۔ شاید ترکی کے بارے میں سوچتا تھا۔ اتنی فکر اتاترک نے نہیں کی ہوگی۔ کمرے میں آنے کے بعد کئی قسم کی گولیاں پھانکتا۔ یہ سب اچھی صحت اور اسمارٹ رہنے کی دوائیں تھیں وہ اے بی سی ڈی یعنی امریکن بورن کنفیوزڈ دیسی تھا۔ لیکن امریکی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا سچ پوچھیں تو چال ڈھال، شکل شباہت، قد کاٹھ، بول چال سے پورا چائنیز ہی دکھائی دیتا تھا دوپہر کے کھانے کے لئے اپنے لیرے خرچ کرنے ہوتے تھے۔ ای ڈی سب کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوتا۔ مراد کھانوں کی قیمت بتاتا تو سنجیدگی سے سنتا پھر اچانک پیٹ پر ہاتھ مار کر کہتا۔ ''میری توند نکل آئی ہے۔ کھانا گول کرنا پڑے گا۔'' پھر موسم کی پرواہ کئے بغیر اِدھر اُدھر دوڑنے لگتا۔ موسم بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ بس ہر روز رات کو ہمیں اطلاع دیتا تھا وہ نزلے اور زکام میں مبتلا ہے اور سارا قصور ترکی پر ڈالتا۔

آسٹریلیا کی زی اور لی کی ہنسی اس درجہ بیہودہ تھی کہ ہر شخص ناپسند کرتا تھا۔ کوچ میں ذرا دیر کو آنکھ لگی ہے اور ان کی وحشت ناک ہنسی کی آواز آئی آنکھ کھل گئی۔ ہم نے ایسی خوفناک اور مکروہ ہنسی زندگی بھر نہیں سنی۔ ای ڈی کو یہ دونوں خواتین زہر لگتیں ایک دن تو غصے میں بولا ''جی چاہتا ہے ان دونوں کو قتل کر دوں'' ہم تو کب سے یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ کوئی انہیں قتل کر کے یہ ہولناک ہنسی ختم کر دے۔ ایک دن موقع پا کر ہم نے زی سے کہا ''آپ کی ہنسی زندگی سے بھرپور ہے۔ .....'' وہ حیران رہ گئی۔

''ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پہاڑوں سے جھرنا گر رہا ہے۔ چشمے بہہ رہے ہیں۔'' وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی......

''ہمیں آپ کی ہنسی اچھی لگتی ہے......'' اس نے ہمیں سنجیدہ دیکھا تو وہی بے ہودہ ہنسی فضا میں بکھیرنے لگی۔ اور پھر کوچ میں ہر شخص کے سر میں درد ہونے لگا۔ سفر تمام ہوا اور ای ڈی نے اپنا ارادہ پورا نہ کیا یعنی زی اور لی کا انجام تمام نہیں کیا۔ ان کی ہنسی آج بھی تصور میں لہراتی ہے تو غصے کی ایک لہر چاروں طرف چھا جاتی ہے...... آج دوپہر جس جگہ ٹھہرے تھے اس ریسٹورنٹ کا نام کوسنا تھا۔ مراد نے آرڈر لئے۔ ہم نے ایک چیز چپس اور پانی خریدا۔ ٹماٹو کیچپ ایسا مانگا۔ تو کوئی سمجھا نہیں مراد نے کہا۔ ''آپ میٹ کچھ اپ کہا کریں......'' ہمیں کیا اعتراض ہماری بلا سے ٹاٹ کہہ دیں گے ...... وہ کچ اپ دے دیں۔ ... ایک چھوٹی پانی کی بوتل

حضرت مریمؑ کے گھر

ترکی کی سیر کے دوران ہمارے نصیب میں ای ڈی لکھا تھا۔ وہ ایک بے ضرر انسان تھا۔ ہمیں کون نقصان پہنچائے گا۔ اگر زندگی میں کسی نے کبھی ہمارے ساتھ برائی کی ہے تو وہ ہم خود ہیں۔ سچ پوچھیں تو انسان اپنا دشمن خود ہوتا ہے۔ ای ڈی ہم سے کم بات کرتا تھا۔ خواتین سے زیادہ ہمکلام ہوتا تھا امریکہ سے آتے وقت وہ جب مختصر سامان لایا تھا اس میں ایک عدد موٹی سی کتاب ترکی کے بارے میں تھی۔ کمرے میں آتے ہی وہ اس کا مطالعہ شروع کر دیتا تھا جیسے گھر بیوی گھر میں آتے ہی کام شروع کر دیتی ہے جب کوئی اجڑی بستی، ویران حویلی دیکھ کر آتے ای ڈی فوراً کتاب سے چیک کرتا۔ مراد نے کیا صحیح بتایا اور کہاں بھٹکایا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ساتھی خواتین کے علاوہ وہ سب چیزوں کے نام بھول جاتا۔ جس جگہ جاتا ایک کتاب خرید لیتا۔ ہم سے کبھی جو مختصر بات ہوتی اس میں ایک بات دہراتا وہ دوبارہ ترکی آئے گا۔ پھر سے یہ سب

لی اور بہت سے نوٹ دیئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ باتھ روم مفت تھا لہٰذا ہم نے اس کی رقم کھانے کے بل سے نکال کر دیکھا تو ٹپس اور پانی بے حد سستا لگا۔

کوچ میں سوار ہو کر حضرت مریم علیہ السلام کے گھر کی طرف چلے۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ راستے میں مراد نے پہاڑوں میں ایک غار کی طرف اشارہ کر کے سات بھائیوں کی کہانی سنائی۔ یہ سب عیسائی تھے۔ رومن بادشاہ کو معلوم ہوا تو انہیں گرفتار کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے۔ یہ ساتوں بھائی اپنے کتے کے ساتھ ایک غار میں چھپ گئے۔ سپاہی ان کا پیچھا کرتے ہوئے آئے تو انہیں پہاڑ میں اندر جانے کا راستہ نہ ملا۔ بہت تلاش کے بعد وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ یہ ساتوں بھائی اپنے کتے کے ساتھ سو گئے خدا نے انہیں گہری نیند سلا دیا۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو ایک بھائی حالات معلوم کرنے اور کھانے کے لئے کچھ خریدنے غار سے باہر نکلا۔ اسے تعجب ہوا کہ وہ سکے جو اس کے پاس تھے۔ اب بازار میں نہیں چلتے نہ انہیں کوئی پہچانتا ہے۔ علاقے میں عیسائی بادشاہ ہے۔ حیرت یہ ہوئی کہ وہ 300 سال تک سوتے رہے جب لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ اس کو بادشاہ کے پاس لے گئے۔ جس نے انہیں سینٹ سمجھا اور غار کو متبرک قرار دیا۔ یہ بھائی بھاگ کر غار واپس آیا اور پھر سو گیا۔ کچھ عرصے بعد زلزلے سے غار تباہ ہو گیا اور صرف پہاڑ رہ گیا۔

وہ پہاڑ سامنے تھا۔ مراد نے بتایا اس کا ذکر قرآن کریم میں بھی اصحاب کہف کے نام سے آیا ہے۔ ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ اس وقت اسلام نہیں آیا تھا لیکن دین ابراہیمی پر لوگ کار بند تھے۔ ایک خدا کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن ترکی والے اپنی تہذیب کو یونانی رومن اور عیسائی بنیاد بنا کر مغرب کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔

پہاڑ گزرا تو کوچ اوپر چڑھنے لگی۔ شہر کی آبادی نیچے رہ گئی۔ پھر بہت نیچے۔ یہاں تک کہ اس کی طرف دیکھ کر خوف آنے لگا۔ ڈرائیور بڑی مہارت سے کوچ بلندی کی طرف لے جا رہا تھا۔ ایک بارش کا چھینٹا پڑا۔ فضا دھل کر صاف ہو گئی۔ درخت اور زیادہ ہرے ہو گئے۔

ایک سیمنٹ کا چوڑا میدان آ گیا۔ کوچ رک گئی۔ مراد اتر گیا۔ سیاح اس کی پشت پر چلنے لگے۔ ایک بڑا دروازہ، الٹے ہاتھ پر دو عمارتیں۔ ایک پوسٹ آفس پھر دونوں طرف ترکی کے سوویئنرز کی دکانیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے آگے بڑھتے رہے۔ میدان میں ایک کنواں۔

جہاں عیسائی بنانے کی رسم ادا ہوتی تھی اور سیمنٹ کی چند سیڑھیوں کے بعد ایک سیاہ رنگ کا مکان۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں حضرت مریمؑ آخری دنوں میں رہیں اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کا انتقال اسی گھر میں ہوا۔ کنواری مریمؑ کے گھر کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ پارک میں داخلے کا ٹکٹ 20 لاکھ 50 ہزار لیرا ہے۔ جو پانی، بجلی، سڑک اور پارک کی دیکھ بھال میں خرچ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں کوئی پارک نہیں۔

مراد نے کہا۔ اس گھر کی پشت پر نیچے کی طرف ''ہولی واٹر'' ہے۔ ایک گھنٹے بعد کوچ روانہ ہوگی۔ آپ اطمینان سے یہاں رک سکتے ہیں۔'' وہ چلا گیا۔ سیاح اس مکان کے آگے عقیدت سے کھڑے ہو گئے۔

19 ویں صدی کے شروع میں جرمنی میں ایک نن انیا کیتھرینا جو کہ اپاہج تھی اور کبھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلی اس نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مریمؑ آخری دنوں میں اس جگہ ایک مکان میں رہتی تھیں۔ اس نے ایک کتاب لکھی جو یورپ میں بے حد مقبول ہوئی۔ حکومت ترکی نے اس پہاڑ پر اس مکان کو ڈھونڈ نکالا اور دنیا بھر میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ سارے سال یہاں عقیدت مند آتے اور دعا مانگتے رہتے ہیں۔ 20 جولائی 1967ء کو پوپ پال چہارم اور 30 نومبر 1970ء کو پوپ لین پال دوئم اس جگہ آئے اور اسے کنواری مریمؑ کا گھر قرار دیا۔

حضرت مریمؑ کے مکان میں جانے کے لئے لکڑی کا ایک سیاہ دروازہ ہے ہم داخل ہوئے تو اندر اندھیرا تھا۔ دائیں طرف ایک سیاہ مجسمہ کرسی پر بیٹھے دیکھا نہ جانے کیوں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اس میں جان پڑ گئی۔ حضرت مریمؑ کے گھر کے طفیل ہم میں عجیب صلاحیت پیدا ہو گئی۔ ہم حیران رہ گئے اور تعجب سے اس مجسمے کی طرف دیکھنے لگے جو ہماری وجہ سے زندہ ہوا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ ہماری طرف کیا سیاہ لبادے میں ایک سفید چہرہ جس پر سنہری کمانیوں والی عینک لگی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ ہم بے چین تھے کہ اپنے ساتھیوں کو بتائیں۔ ہم نے ایک معجزہ کیا تھا۔ حضرت مریمؑ نے اپنی دعا سے ہم میں بھی مسیحائی پیدا کر دی ہے۔ سب سر جھکائے کھڑے تھے برابر کے کمرے میں حضرت مریمؑ نے زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔ سب اس طرف چل دیئے۔ یہاں بھی اندھیرا تھا۔ صرف موم بتیاں جل

رہی تھیں۔

ان کے استعمال کی کچھ چیزیں رکھی تھیں۔ لوگ دعائیں مانگ رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب صلیب پر چڑھایا تو انہوں نے کس طرح اپنی ماں حضرت مریمؑ کو خطاب کر کے کہا آپ کے پاس جو جون کھڑا ہے۔ اسے اپنا بیٹا سمجھئے۔ اور جون سے کہا۔ "آج سے یہ تمہاری ماں ہے۔ اسے کسی حال میں اکیلا نہ چھوڑنا"۔ حضرت عیسیٰؑ کی صلیب کے بعد یروشلم میں یہودی ان کے دشمن ہو گئے اور وہ سینٹ جون کے ساتھ افیسس کی پہاڑیوں میں آبسیں اور یہیں زندگی کے آخری دن گزارے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ سینٹ جون کے ساتھ واپس یروشلم چلی گئیں اور یہودیوں نے انہیں قتل کر دیا۔ جو کچھ بھی ہو اس مکان سے ان کی نسبت تھی۔ یہی کافی ہے۔

ہم دوسرے کمرے سے پہلے کمرے میں آئے۔ ہمارے بیشتر ساتھی "ہولی واٹر" کی طرف چلے گئے تھے اور جس مجسمے میں ہم نے جان ڈالی تھی وہ ایک سیاح سے بات کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھا تو مسکرا کر پوچھا۔

"انڈیا..... "

"پاکستان..." ہم نے جواب دیا۔

"سنا ہے وہاں عیسائیوں پر سختیاں ہو رہی ہیں۔" وہ بولیں۔

"نہیں۔ وہ ہم پر سختیاں کر رہے ہیں..... "

"وہ کیسے"..... ان کی گول گول آنکھیں چشمے کے شیشے کے پیچھے اور گول ہو گئیں۔

"شہر کے بیچوں بیچ ہزاروں لاکھوں گز زمین گرجا کے آس پاس گھیری ہوئی ہے..... ہم اپنے بچوں کو ان کے اسکولوں میں داخل کرانا چاہتے ہیں وہ سخت شرطیں رکھتے ہیں دو دو دن اپنے دفتر کے آگے لائنیں لگواتے ہیں۔ آپ کے سینٹ کے ناموں پر جو اسکول کھولتا ہے..... خوب ترقی کرتا ہے..... "

وہ مسکرا رہی تھیں..... "ہم نے سنا تھا..... "

"وہ ہندوستان میں ہوتا ہے"..... ہم نے ان کا جملہ کاٹا۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں..... "

"امریکہ"..... وہ بولیں۔

"کس علاقے کی..... "

"نیویارک..... "

"ہم وہیں رہتے ہیں..... کیا پتہ ہے..... "

"معلوم نہیں..." وہ حسرت سے بولیں

"کیا مطلب..... "

"چار سال پہلے تک معلوم تھا..... "

"آپ کا رابطہ نہیں ہوتا..... "

"نہیں..... "

"کیوں..... "

"اجازت نہیں ....." ان کی مسکراہٹ میں اداسی تھی۔

"وجہ..... "

"میں نن ہوں۔"

"کتنے سال تک رابطہ نہیں ہوگا..... "

"سات سال تک"

"اوہ مائی گاڈ....." "آپ رات کو یہیں رہتی ہیں..... "

"نہیں رات کو یہ گھر بند کر دیا جاتا ہے..... "

کوچ روانہ ہونے میں دیر تھی۔ لیکن کچھ اور سیاح اندر آ رہے تھے اس لئے ہم انہیں 'خدا حافظ' کہہ کر نکلے تو انہوں نے کہا.....

"کنواری مریم آپ کی حفاظت کرے۔"

باہر نکل کر دکانوں پر اٹکنا ضروری تھا۔ اسے ونڈو شاپنگ کہتے ہیں۔ دکانداروں کی پکڑ سے ایک تجربہ کار سیاح بچ سکتا ہے اور ہمیں فخر ہے کہ یہ صلاحیت ہم میں ہے۔ پوسٹ آفس کی سیڑھیاں ہم نے خود چڑھیں تاکہ لاکھوں لیرا دے کر پاکستان کے لئے ڈاک کے ٹکٹ خرید سکیں۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ کوچ میں بیٹھے اور وہ چلی تو نیچے اترنے لگی۔ کنواری مریم کا گھر اور سیاہ

لباس والا ان اور سیاحوں پر حملہ کرنے کے انتظار میں کھڑے دکاندار ماضی ہو گئے۔

آج کوچ کا سفر لمبا تھا۔ مراد نے تجویز رکھی سب لوگ لطیفے سنائیں گے۔ ایک ایک کر کے مائیک سب کے پاس آیا۔ بل نے انتہائی کمزور لطیفے سنائے۔ ای ڈی کا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

ہمارا نمبر آ گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کون سا لطیفہ سنائیں۔ پھر معذرت کی اگر وہ برا نہ مانیں تو سنا دیں۔ سب نے اصرار کیا۔ ہم نے کہا۔

ایک فادر تھے۔ انتہائی شریف، ایماندار اور ملنسار۔ ایک بار ان سے کسی نے پوچھا۔

"فادر واٹ از یور ہابی......"

فادر نے کہا۔ "نن"

لوگوں نے چند لمحے سمجھنے میں لگائے پھر زور سے ہنسنے لگے۔

لطیفے ہوتے رہے۔ باہر سرد موسم پھیلا ہوا تھا اور کوچ میں زندگی سے بھرپور، صحت مند، تر و تازہ، دیس دیس سے آئے لوگ ہنس رہے تھے خوش ہو رہے تھے۔ زندگی کے یہ لمحے کتنے حسین ہوتے ہیں اور جب گزر جاتے ہیں تو یادوں کے البم میں سج جاتے ہیں۔

....

الی شا اور ای ڈی

ای ڈی میں ایک کمال تھا۔ جس عورت سے چاہتا گپ لڑانے لگتا۔ نے تو اس کی دوست تھی۔ ادھر اُدھر بھی ہاتھ مارتا۔ جہاں پیدل چلنے کا مرحلہ آتا دو قدم کے بعد کسی نہ کسی کے ساتھ چل پڑتا۔ بظاہر تو اس میں کوئی کشش نہیں تھی پھر بھی آسٹریلیا سے ماں کے ساتھ آنے والی الی شاہ اس کے پیچھے لگ گئی۔ جہاں دیکھتی اس سے چمٹ جاتی سب سے کمسن شوخ اور آزاد خیال تھی۔ مراد سے بھی ہاتھ ملاتی تو چھوڑنے کا نام نہ لیتی۔ جس کے پاس چاہتی جا بیٹھتی۔

بعض وقت تو کاندھے پر سر رکھ دیتی۔ ہم ان چیزوں کو پسند نہیں کرتے۔ ویسے بھی کلے ہمارے ساتھ والی نشست پر ہوتی اس لئے ہمارا کاندھا اس کے سر سے دور رہا۔ ایک دن عجیب بات ہوئی۔ اس نے لنچ کے وقت کوٹ اتارا اور سب کے سامنے ای ڈی سے کہا مالش کرے۔

اس ظالم نے الی شا کے کاندھوں پر دبانا شروع کیا پھر بغلوں میں ہاتھ ڈال کر سینہ دبایا۔ اس کے بعد کولہوں پر ہاتھ رکھے۔ پشت سے خوب دبوچا۔ ہم سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور اس طرف سے نظریں پھیرلیں آخر کو شرم و حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہمارا خیال تھا بلکہ کان انتظار کر رہے تھے کب ایک زوردار تھپڑ اور ساتھ میں الی شا کی ماں کے چیخنے کی آواز آئے گی مگر کچھ نہ ہوا۔ اس بات سے دیر تک آزردہ رہے۔ ایک تو الی شا کے کردار پر دکھ ہوا اور اس کی ماں کی لاپرواہی پر غصہ آیا۔ اگر ای ڈی کی جگہ ہم ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ شرفاء کے ہاتھ میں ہوتی۔ خیر تھی۔

اس دن جب لنچ کے لئے ایک ریسٹورنٹ میں پہنچے تو ہم جان بوجھ کر نے کے پاس جا کر بیٹھے اور جب ای ڈی اپنے لیرا بچانے باہر سردی میں دوڑنے چلا گیا تو ہم نے اسے بتایا ''ای ڈی کے ہاتھوں میں جادو ہے وہ جب مالش کرتا ہے جسم میں نئی تازگی فرحت راحت آجاتی ہے۔ کیا تم نے کبھی مالش کرائی......''

''نہیں''

''کیوں...... یہ سہولت مفت ہے۔ دیکھو الی شا کے اس نے مالش کی کتنی تر و تازہ لگ رہی ہے۔ تم بھی ایسی ہی لگو گی... ''

اس کی اور الی شا کی عمر میں کم از کم 40 سال کا فرق تھا۔ اس نے جو سنا کہ وہ ایک نوجوان کمسن لڑکی لگے گی تو فوراً مالش کے لئے تڑپ اٹھی۔ ہم نے سمجھایا۔ جب ہوٹل پہنچے تم سب سے پہلے فرمائش کر دینا۔ اس کے بعد آئیڈیا اور کلے کو بھی یہی بات بتائی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ جب ہم ہوٹل کی لابی میں پہنچے۔ اپنے سامان رکھ کر سب واپس آئے تو الی شا نے ای ڈی کو دبوچا۔ ''مساج'' اسی وقت نے آئیڈیا۔ کلے اور سیلیا چمٹ لیں۔ پہلے ہمارا مساج۔ ای ڈی اس حملے سے گھبرا گیا۔ لیکن یہ تر و تازہ ہونے اور جوان بننے کے جنون میں چھوڑنے والی کب تھیں۔ ای ڈی بھی ایک کائیاں آدمی تھا۔ اس نے وہ ہاتھ دکھائے کہ ایک ایک کر کے خواتین نے تو 'شکریہ شکریہ' کہہ کر اپنی جان بچائی لیکن اس عرصے میں الی شاہ آسٹریلیا سے آئے ایک اور لڑکے سے لگ لی تھی۔ نیویارک سے آئے مل نے ای ڈی کو اکیلا دیکھا تو دبوچ کر الگ میز پر لے گیا اور اپنی ریاست کے قصے سنانے لگا۔

ڈنر کا وقت سوا سات بجے تھا۔ اس لئے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو سوپ دیا جانے لگا۔ یہ

دہی سے بنایا گیا ہے ترکی والوں کا قومی مشروب لسی ہے۔ ہر موسم میں پیتے ہیں۔ آج اسی کو گرم کر کے اوپر سے زیتون کا بگھار لگا کر پیش کیا گیا تھا۔ ہم نے اوپر سے زیتون کا تیل ہٹا کر پیا۔ عجیب سا ذائقہ تھا دو چار چمچے لئے تو عادی ہو گئے۔ دوسری بار مانگ کر لیا۔ آنے والے کھانے کا علم نہیں تھا۔ ترکی والوں کا کہنا ہے کہ یوگرٹ ترکی کا لفظ ہے۔ صبح دوپہر شام یہ دہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیرا، ٹماٹر اور زیتون بھی خوب کھائے جاتے ہیں۔ ڈبل روٹی خاص غذا ہے۔ گوشت بھی نوش کیا جاتا ہے لیکن بے حد چھوٹی بوٹیوں کی شکل میں جتنا وہ ایک ماہ میں کھاتے ہیں اتنا تو ہم ایک دن میں چٹ کر جاتے ہیں۔ چاول دیکھ کر افسوس ہوا۔ امریکہ سے منگاتے اور ابال کر کھاتے ہیں۔ ہم باسمتی اگانے والے ملک کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے منہ کو یہ کب لگتے ہیں۔

ہم ای ڈی سے روز اپنے چاولوں کی تعریف کرتے اور وہ ہمیشہ انہیں پکانے کی ترکیب پوچھتا۔ ترکی میں کافی بہت پی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں کسی کھانے کے بعد نہیں دی گئی۔ یہ دوست بنانے کے کام بھی آتی ہے۔ افسوس ہمیں کسی نے دوست نہیں بنایا۔ اگر آپ صرف کافی کہیں تو نیس کیفے کافی ملے گی اور اگر ٹرکش کافی چاہیے تو ٹرکش کا لفظ کہنا پڑے گا۔ یہ عام کافی سے مختلف ہوتی ہے ترکی میں کافی نہیں اگائی جاتی برازیل سے آتی ہے...... اور خوب پی جاتی ہے۔

کھانے کے بعد اکثر پھل مل جاتے جو سائز میں بڑے اور ذائقے میں برے ہوتے تھے۔ نارنگیاں پیدا کرنے والا ملک اس پھل سے محروم ہے۔ کیلا غالباً دوا کے لئے استعمال ہوتا ہے......

آئیڈیا ہر روز ناشتے میں سے بہت سی چیزیں ایک رومال میں باندھ لیتی اور کہتی میں اپنے لنچ کے لئے اٹھا رہی ہوں۔ گئی اور لوگ بھی ابلے انڈے، بسکٹ اور مکھن رکھ لیتے۔ اس کے باوجود بھی کسی نہ کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کرتے چائے کافی نوش کرتے رہتے۔

....

لیرا اخلاص

ترکی والے کھدائی کے ماہر ہیں۔ جو جی چاہتا ہے زمین سے نکال لیتے ہیں شہروں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن ظالموں نے ایک قبرستان نکال لیا۔ دو ہزار سال قبل مسیح جو دفنائے گئے ان کی قبریں نکال لیں ایک طرف کمرے بنے ہیں۔ اونچے نیچے۔ بعض قبریں کھلی ہیں۔ کچھ پر پتھر رکھے ہیں۔ یہ سلسلہ دور تک نظر آتا ہے۔ جس وقت ہم پہنچے اس وقت بھی کھدائی ہو رہی تھی۔ یونیسکو نے اسے بین الاقوامی ورثہ قرار دے کر کام شروع کر دیا ہے کوچ روک دی گئی۔ سیاح قبروں کی تصویریں لینے دوڑے۔ عجیب قبریں ہیں۔ لمبی چھوٹی، بھاری پتھروں سے ڈھکی، کھلی اور اِدھر اُدھر ستون بھی پڑے ہیں۔ اس کا مطلب ہے۔ بعض قبروں پر چھت بھی ہوگی۔ جو پتھروں پر رکھی گئی ہوں گی۔ مراد نے بتایا یہ قبرستان بڑا ہو کر شہر تک پہنچ گیا تھا۔ معلوم نہیں یہ شہر کے لئے برا تھا یا قبرستان کے لئے۔ دائیں طرف قبرستان اور بائیں طرف شہر کے آثار تھے۔

دروازے جنہیں یونیسکو نے کھڑا کیا تھا ٹوٹی سیڑھیاں اور دیواریں۔ اس طرف بھی کوچ روکی گئی تصویریں بنانے کے لئے حیرت تھی کہ اس علاقے کا کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ مراد لیرا خرچ کرنے کی زحمت سے بچا۔ یہ علاقہ پاموکلی میں ہے جو کسی زلزلے کی وجہ سے مکمل طور پر برباد ہوگیا اور ترک انتظامیہ نے کھود نکالا۔ ہمیں متاثر کرنے کے لئے......

ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے ڈھیروں قبرستان ہیں جو کھود کر نکالنے نہیں پڑے۔ جگہ جگہ ہیں۔ ان کا جغرافیہ اور تاریخ بیان کریں تو ہر ملک کا سیاح حیران ہوسکتا ہے۔ کراچی میں ایک چوکنڈی کا قبرستان ہی کافی ہے۔ جس کی قبریں ایسی داستانیں سناتی ہیں کہ ہم چاہیں تو سارے جہاں کے ٹورسٹ اس طرف رخ کرلیں لیکن ہم ان چھچھوری حرکتوں پر اپنا وقت برباد نہیں کرتے۔ پرانے کھنڈر اور قبرستانوں کے نام پر ڈالر نہیں کھینچے۔

پاموکلی کے قبرستان کی قبریں امیروں اور غریبوں کا فرق صاف بتاتی ہیں۔ ہماری کوچ روانہ ہوئی تو قبرستان دیر تک ساتھ رہا اس کے بعد کاٹن پیلس کا علاقہ آ گیا۔ یہاں کپاس اگائی جاتی ہے۔ اس لئے مکانوں کی چھتیں سفید ہیں اور آگے جا کر تین گرم پانی کے چشمے ہیں جن میں چونا ہوتا ہے، اور اس میں نہانے سے بہت سی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس لئے پاموکلی کے علاقے میں شہر آباد ہوا جو زلزلے سے برباد ہوگیا۔

کوچ ایک بڑی عمارت کے پاس جا کر رکی یہ ہوٹل تھا اور مراد کے پیچھے سیاح چل پڑے۔ اندر دکانیں تھیں۔ لوگ میزوں کے گرد بیٹھے تھے اس کے بعد دو چھوٹے پل تھے جن کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ مراد نے بتایا یہ گرم پانی کے چشمے ہیں۔ پھر ان کے درمیان سے گزر کر چند گز آگے۔ اس نے نیچے دیکھنے کو کہا۔ وہاں پانی ایک کونے میں ابل رہا تھا۔ مراد نے بتایا یہاں سے چشمہ نکل رہا ہے۔ اسے دیکھ کر سب نے حیرت کا اظہار کیا۔ ان میں ہم بھی شامل تھے۔ اگر سیاح گائیڈ کی بات پر نہ چونکے۔ حیران نہ ہو...... اور فوراً تصویر نہ اتارے تو گائیڈ اسے اپنی توہین سمجھتا اور دیر تک موڈ خراب رکھتا ہے۔ سفر کے دوران ہر لمحہ اور ہر قدم سیاح اپنی خرچ کی ہوئی ایک ایک پینی اور سینٹ سے حیرت اور مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے اس لئے گائیڈ کا مزاج خوشگوار رہنا چاہئے۔

مراد نے ابلتا چشمہ دکھا کر کہا۔ ''آپ لوگ جا کر ان چشموں کو دیکھ آئیں جن میں چونا

ہوتا ہے اور اتنی مقدار میں کہ ہر طرف جمع ہوتا رہتا ہے ایک گھنٹے بعد یہاں سے روانگی ہے" اور ہمارے نزدیک آ کر بولا۔" عباسی دائیں طرف جا کر پوسٹ آفس ہے جہاں سے فون کارڈ اور برابر بینک سے ڈالر کے بدلے لیرا لیا جاسکتا ہے۔" ہمارے ساتھ تھے۔ کلے اور سیلیا نے باتھ روم کی طرف سفر کیا۔ جو مفت تھا اس کی عجیب خوشی ہوئی۔ وہاں سے باہر نکلے تو ہمارے ساتھی اِدھر اُدھر ہو گئے۔

ہم نے بینک کا رخ کیا۔ وہاں رش تھا۔ بھیڑ میں گھس کر جب کاؤنٹر پر پہنچے 50 ڈالر کا نوٹ دکھا کر لیرا مانگے۔ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ہم سمجھے وہ نوٹ کو جعلی سمجھ رہا ہے۔ اس لئے 100 ڈالر کا نوٹ دیا۔ پھر بھی اُدھر سے انکار ہوا۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا اور نوٹوں کی گڈی دکھائی۔ جس کا مطلب تھا۔"لیرا خلاص" ہم نے 10 ڈالر کا نوٹ دے کر درخواست کی" ظالم اسی کے بدلے کچھ لیرا دے اللہ بھلا کرے گا" یہ بات اس کی سمجھ میں آئی۔ چند پرانے نوٹ ہمارے حوالے کر دیئے ہم نے شکریہ ادا کیا۔ برابر پوسٹ آفس تھا۔ ذرا دیر پہلے اسے کھلا دیکھ کر گئے تھے اب وہ بند تھا۔ غالباً ترکی کے بعض علاقوں میں پوسٹ آفس کے اوقات ان کے کام کرنے والوں کی مرضی پر منحصر ہیں جی چاہا کھول دیئے ورنہ بند۔

اس طرف سے ہماری دلچسپی ختم ہوگئی تھی۔ اس لئے پہلے یہ دیکھا کہ کوچ کہاں پارک ہے۔ پھر چوڑی سڑک پر اس سمت چلے جہاں لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے۔ چونا ملا پانی دیکھنے۔ یہ زیادہ دور نہیں تھا۔ جلد پہنچ گئے۔ عجیب منظر تھا۔ پانی کے چاروں طرف سفید سفید ٹیلے، پہاڑ اور چوٹیاں بنی تھیں جیسے برف ہی برف ہو۔ یہ چونا تھا جو پانی میں بہہ کر آ رہا تھا اور جمع ہو رہا تھا۔ لوگ پانی میں ننگے پاؤں کھڑے تھے۔ اس مجمع میں ہمارا ای ڈی بھی کھڑا صحت مند ہو رہا تھا۔ ہمیں بھی بلانے لگا۔ جوتے، موزے اتار کر پانی میں اترنا۔ پھر دوبارہ واپس آ کر جوتے پہننے کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہم نے ای ڈی سے فوٹو کھینچنے کی درخواست کی اس نے کہا" پانی میں کھڑے ہو جاؤ....."

ہم ایک منڈیر پر چڑھ گئے۔ پشت پر پانی اور چونے کے ڈھیر صاف نظر آنے لگے۔ کسی پانی میں چونا ہم نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اچانک سورج مغرب کی طرف جھک گیا۔ پانی میں آگ لگ گئی۔

کوچ کی روانگی کا وقت تھا۔ ہم واپس آئے تو دیکھا سیاحوں کی معلومات کا ایک دفتر ہے۔ جو 24 گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ اس وقت بند تھا شاید 25 واں گھنٹہ ہو۔

ایک چکر ہوٹل کے اندر لگایا مختلف ملکوں کے سیاحوں کو دیکھا ان میں اکثر چینی تھے۔ ای ڈی کا کہنا تھا یہ سب جاپانیز ہیں۔ چین والوں کے پاس اِدھر اُدھر سیر سپاٹے کے لئے رقم کہاں۔ کیونکہ ہمیں اس کے ساتھ رہنا تھا اور تعلقات اچھے رکھنے تھے لہٰذا جو اس نے کہا تسلیم کیا چین، جاپان سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔

****

ہو گیا۔ وہیں وہ اکیلے تھے۔ سردیوں میں وقت گزارنے کے لیے بازار چلے جاتے اِدھر اُدھر دکانوں میں جا گھسنے کوئی کام کی چیز نظر آتی مول تول کرتے۔ ایک دن دیکھا ایک خان صاحب کی قالین لیے بیٹھے ہیں۔ یہ دیر تک کھڑے دیکھتے رہے۔ ایک بہت ہی خوبصورت اور دلکش قالین تھا۔ دل میں کیا آئی کہ قیمت پوچھ لی

"30 ہزار روپیہ" خان صاحب نے بتایا۔

انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا لیے۔ 30 ہزار روپے کا قالین ملازم پیشہ تو خرید نہیں سکتا۔ اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجھ گمان حسب معمول کسی چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک افغانی قالین پر نظر پڑی یوں ہی قیمت پوچھ لی۔ خان صاحب نے کہا۔

"30 ہزار روپیہ"

قیمت اتنی تھی کہ کم کرانے کو بھی کہا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے یہ چپ چاپ وہاں سے سرک لیے۔ اس واقعے کو ایک ماہ گزر گیا۔ پھر انہیں ایک بازار کے کونے پر ایک خوبصورت قالین نظر آیا۔ انہوں نے دیکھا۔ اس بار ہاتھ بھی لگایا اور پوچھا۔

"خان صاحب، اس کی قیمت کیا ہے"

خان نے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولا "آپ کیا دے گا"

"آپ قیمت تو بتائیں" مجھ انہیں سمجھ گئے کہ یہ کوئی ہزار دو ہزار کا قالین ہے اور پانچ سو تک مل جائے گا۔

"اس کا قیمت تو 30 ہزار ہے۔ لیکن آپ بولو"

قیمت سن کر یہ چونکے اور غور سے دیکھا تو پہچان گئے۔ یہ تو وہی خان ہے جس سے دو بار پہلے بھی پوچھ چکے ہیں۔ یہ سمجھے تھے کسی اور خان سے دریافت کر رہے ہیں۔ قالین وہی پہلے کی سی شان کا تھا اور یہ ہی لگے میں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا یہ شخص مسلسل مذاق کر رہا ہے۔ "خان صاحب اس کی قیمت زیادہ ہے ہمیں پتا نہیں"

"بھائی آپ قیمت تو بولو" خان صاحب نے غصہ ضبط کر کے انتہائی نرمی اور تحمل سے کہا۔ مجھ انہیں نے سوچا 30 ہزار کا قالین کتنا کم کرے گا۔ اس لیے سوچ میں پڑ گئے

"بھائی آپ دام بولو۔ ہمارا چیز ہے۔ دے نہیں دے" خان صاحب کا غصہ بڑھ رہا تھا۔

لڑکیوں سے گفتگو

مردوں نے کوچ رکنے سے پہلے چوتھی بار لڑکیوں کے کمسن اور خوبصورت ہونے کا ذکر کیا تو ہم چونکے۔ یہ عمر بھی کیسی؟ ہم تو نظارہ دور دور سے کرتے ہیں کیا اب ہاتھ لگانے کی اجازت ہوگی۔ وہ جو ہم سمجھے آ رہے تھے کہ ترکی بیگمات تک ہے اس کا مطلب ہو گا۔

کوچ ایک عمارت کے سامنے رک گئی اور مردوں کے ساتھ ساتھ ہم اندر داخل ہوئے یہ عمارت کا ہینڈ ویونگ سینٹر تھا۔ آج قالین بننے کا کارخانہ عام حالت میں کھلا ہے دیکھنے میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس قسم کے کارخانے ہمارے ہاں گلی گلی ہوتے ہیں اگر کارخانے نہیں تو ہمارے خان صاحب ہر چوراہے پر ایک سے ایک قالین لگائے خریداروں کو دیکھتے بیٹھے رہتے تھے۔

ہمارے ایک جاننے والے مجھ انہیں ریڈیو میں ملازم تھے۔ ایک بار ان کا بازار کو نکلنا

''آپ برا تو نہیں مانیں گے......'' نجم الحسنین نے پوچھا۔

''نہیں بھائی آپ قیمت تو بولو......'' خان کی ہمت ملاحظہ ہو۔

نجم الحسنین نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''خاں صاحب 3 ہزار... ؟''

خاں صاحب نے ایک نظر انہیں دیکھا اور کہا...... ''چلو نکالو......''

ان کے پاس تین ہزار کہاں ..

یہ بولے...... ''خاں صاحب ابھی تو نہیں ہیں۔ ہم کل لا کر دیں گے... ''

''گھر پر ہیں ......''

یہ ڈر کر بولے۔ ''ہاں کل لا دیں گے۔''

خان نے یہ سُنا تو پاس سے گزرتے ہوئے رکشہ کو روک لیا۔ قالین لپیٹ کر رکشہ کے اوپر باندھا پھر نزدیکی دکاندار سے کہا..... ''دکان کا خیال رکھنا......'' اور نجم الحسنین کو رکشہ میں بٹھا کر کہا ....'' گھر کا پتہ بتاؤ......''

اب سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ ان کے گھر دو چار سو روپے سے زیادہ نہیں تھے اور اگر یہ قالین نہیں خریدتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا خان گولی مار دے گا۔ یہ اپنے گھر کے بجائے دوست کی طرف گئے رکشہ روک کر ساری بات بتائی۔ اس کے پاس بھی اتنی رقم نہ تھی۔ لہٰذا دو چار گھروں سے جمع کر کے دیئے گئے۔ وہ قالین قیمتی تھا۔ لیکن ان دنوں 3 ہزار کی رقم زیادہ قدر رکھتی تھی۔

ایک دن ہم بھی کراچی میں آغا خان اسپتال کے آگے دیواروں پر بچھے پیڑوں پر لٹکے قالین کی قیمت پوچھ بیٹھے۔ اس نے بتائی۔ ''پانچ ہزار'' ہم نے کہا.... ''خاں صاحب یہ تو بہت زیادہ ہے......''

''آپ کیا دے گا .....''

''ایک ہزار'' کہہ کر ہم نے ڈرائیور سے کہا گاڑی بھگالو۔ ''کیونکہ وہ ایک ہزار میں دینے پر آمادہ نظر آتا تھا۔'' کیوں'' ہمارے ڈرائیور نے پوچھا۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ وہ بھی خان تھا۔ ہم اسے کیا بتاتے صرف اتنا کہا۔ ''پیٹ میں شدید درد اٹھا ہے'' جب تک ڈرائیور نے گاڑی چلائی خان آواز دے کر کہہ چکا تھا۔ ''چلو نکالو ہزار'' خدا کا شکر ہے یہ'' آواز ہمارے

خان کے کان میں نہیں پہنچی تھی۔ اس دن کے بعد ہم قالین کی دکان تک میں داخل نہ ہوئے۔ لیکن ترکی کے اس کارخانے کی بات اور تھی۔ یہاں کمسن اور خوب رو لڑکیوں سے بات چیت اور ملاقات تھی۔

مول تول خرید وفروخت کا سوال ہی نہیں تھا۔

ایک بڑے دروازے کو پار کر کے اندر داخل ہوئے سامنے دو انتہائی بوڑھی خواتین نظر آئیں جو زمین پر بیٹھی تھیں اور ان کے سامنے اون کا ڈھیر تھا۔ اب ہم سمجھے مراد ایک دلچسپ آدمی تھا اور انہی بوڑھی خواتین کو کمسن اور حسین کہہ رہا تھا۔ یہ بھی آج سے 60 یا 70 سال پہلے جوان رہی ہوں گی۔ وقت اور بدلتے موسموں نے حسن اور جوانی چھین لی تو کیا ہوا۔ اگر ہم 50 سال پہلے آتے تو حسن و جمال کا دیدار کرتے۔ قالین کے کارخانے کے منیجر کیز بھی آگئے ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بار بار ہاتھ ملاتے اور مسکراتے تھے۔ مراد نے ان بزرگ خواتین سے کہا کہ اون کا دھاگہ بنا کر دکھائیں۔ پہلی نے ایک لکڑی کا لٹو سا اٹھایا اور ریشم کے دھاگے کو اس پر ڈال کر ہوا میں ہلانے لگیں۔ ایک دھاگہ بن کر دوسری طرف جانے لگا۔ مراد نے پوچھا...... ''کوئی سوال'' سب چپ رہے...... پھر دوسری خاتون سے کہا انہوں نے ریشم کا تار ایک چرخے پر چلانا شروع کیا۔ اس سے دھاگہ بن کر ایک پھرکی جیسے لٹو پر لپٹنے لگا۔ یہ دھاگہ بن رہا تھا۔ جس سے قالین بنایا جاتا ہے، اون بھیڑوں سے اور ریشم کے کیڑوں سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ پہلا مرحلہ تھا اس کے بعد ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئے جہاں پندرہ لڑکیاں سر جھکائے قالین بن رہی تھیں۔ یہ سب واقعی کمسن تھیں مراد نے بتایا کہ 17 اور 18 سال کی ہیں لیکن ہمارا خیال ہے ان کی عمریں 14، 15 سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ قالین بننے کے لئے چھوٹے عمر کی لڑکیاں اور لڑکے درکار ہیں۔ ان کے ہاتھ نرم ہوتے ہیں پاکستان میں یہ کام نو عمر لڑکے انجام دیتے تھے۔ اس پر دنیا بھر میں ہنگامہ ہوا۔ یہاں تک کہ پاکستان سے قالین منگانے بند کرنے کی دھمکی دی گئی۔ اس میں وہ ملک زیادہ ہوا دینے والے تھے جو قالین سازی میں شامل ہیں۔ ترکی میں یہی کام انتہائی کمسن لڑکیاں کر رہی تھیں تو کسی کو اعتراض نہیں ہے۔

ہم ایک کھڈی کے پاس کھڑے تھے جس پر سر جھکائے ایک لڑکی رنگین دھاگوں کی مدد سے قالین بنا رہی تھی۔ یہ سنگل بُنائی تھی اس میں صرف ایک گانٹھ لگائی جاتی ہے۔ مختلف رنگوں

کے دھاے اوپر سے لٹکتے ہیں۔ لڑکی کے پاس قالین کا ڈیزائن ہے وہ اسی ترتیب سے رنگین دھاگے لے کر لگاتی جاتی ہے۔ انتہائی مہارت اور پھرتی سے کام کر رہی تھی اس کا چہرہ قالین کی طرف تھا۔ پلکیں آنکھوں پر جھکی تھیں اور صرف ان رنگین دھاگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ سفید ہاتھ رنگوں کو یکجا کر رہے تھے۔ پھر یہ تمام عمر کسی کے قدموں میں بچھ جائیں گے برسوں کی محنت پاؤں تلے روندی جائے گی۔ اس بات نے افسردہ کر دیا۔

ایک اور لڑکی ڈبل ناٹ سے قالین بنا رہی تھی اس میں دوبار گانٹھ لگائی جاتی ہے..... دوگنا وقت لگتا ہے۔ بڑی توجہ اور مہارت سے رنگین دھاگوں سے بنے جاتے ہیں۔ جس طرح سوئٹر کی بنائی ہوئی ہے اس لڑکی کے کام کی رفتار ذرا کم تھی۔

اس کے بعد ایک لڑکی سلک کے قالین بنا رہی تھی۔ یہ انتہائی نفاست سے بنایا جاتا ہے۔ اس میں سنگل اور ڈبل دونوں ناٹ لگائی جاتی ہیں یہ تمام لڑکیاں یہاں کام سیکھتی ہیں۔ یہ ٹریننگ سینٹر بھی ہے اور پھر یہیں کام کرتی ہیں۔ ہر لڑکی دو تین گھنٹے کام کے بعد آرام کرتی ہے۔ مسلسل زیادہ دیر تک نہیں ہو سکتا۔

ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تمام لڑکیوں نے سروں پر اسکارف باندھ رکھا تھا۔ ہم نے مراد سے پوچھا۔ "سرکاری ملازمتوں اور سرکاری عمارتوں میں اسکارف پر پابندی ہے پھر یہاں.....؟"

"یہ ادارہ آدھا سرکاری اور آدھا پرائیویٹ ہے....."

"پھر تو آدھے سر پر اسکارف ہونا چاہئے تھا....." ہم نے کہا

مراد ہنس دیا۔ ایسی باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

وہ بار بار کہتا "ان لڑکیوں سے سوال کریں....."

جس مہارت اور تندہی سے یہ کام کر رہی تھیں اس میں کوئی بھی انہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"یہ قالین کتنے دن میں بنتا ہوگا....." مراد نے ہم سے پوچھا۔

"دو ماہ میں....." ہم نے بتایا

"اوہ نو..... ڈیڑھ سال میں..... وہ بولا۔"

"اور یہ سلک کا....." مراد نے سوال کیا۔

"ایک سال....." کئی آوازیں آئیں۔

"چار سال....." مراد نے جواب دیا۔

ہمیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ قالین بنانے میں اتنا وقت لگتا ہے۔

کارپٹ کارخانے کے منیجر نے ایک کمرے میں لے جا کر وہ ڈیزائن دکھائے جن سے قالین بنائے جاتے ہیں۔ لوگوں کے آرڈر پر فرمائشی ڈیزائن بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا کمرہ جہاں ریشم پر رنگ کیا جاتا ہے بہت سے ڈرم میں رنگ رکھے تھے۔ یہ پھولوں، درختوں کی چھالوں اور تمباکو سے حاصل کیا جاتا ہے۔ پھر اس میں ریشم کے دھاگے ڈبوئے جاتے ہیں۔ رنگین بنانے کے لئے۔ ہمیں تمباکو کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی کہ یہ بھی رنگوں کی دنیا میں کمال کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک ایسا کمرہ جہاں ریشم حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کیڑا ہے جو شہتوت کے پتوں پر ہوتا ہے۔ اسے پالا جاتا ہے یہ اپنے گرد منہ کے لعاب سے دھاگا بنا کر چاروں طرف اوڑھ لیتا ہے..... اگر یہ زیادہ دن رہے تو سوراخ کر کے تتلی بن کر اڑ جاتا ہے۔ اسے آخری مراحل میں شاک دے کر مار دیتے ہیں تاکہ یہ اپنے خول سے باہر نہ نکلے۔ ایک خول سے ایک میل ریشم کا دھاگہ نکلتا ہے۔ اس جگہ ہلکے گرم پانی میں یہ خول پڑے تھے اور مشین کے ذریعے ان پر لپٹے ہوئے ریشم کے تار نکالے جا رہے تھے۔ انسان نے قدرت کے خزانوں سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

کارپٹ کارخانے کا آخری مرحلہ ایک ہال تھا۔ جس کے تین طرف بیٹھنے کی جگہ اور درمیان میں قالین رکھے تھے۔ سیاح یہاں بٹھا دیئے گئے مراد کوچ میں ہی کہہ چکا تھا کہ اس کارخانے میں قالین مہنگے ہوں گے۔ ایک بار پھر اس نے منتظمین کی نظریں بچا کر اپنی بات دہرائی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا اس جگہ سے مراد کو کمیشن نہیں ملتا تھا۔ ہم نے اسے یقین دلایا۔ "ہم یہاں سے کچھ نہیں خریدیں گے....." ورنہ ہو سکتا ہے 50 یا 60 ہزار ڈالر کا کوئی قیمتی قالین خرید کر اپنے ڈرائنگ روم میں اپنے پیروں سے روند رہے ہوتے۔

ہال میں تین چار افراد داخل ہوئے۔ ان میں ایک سوٹ پہنے معزز شخص تھا۔ پہلے اس نے

تعارف کرایا۔ پھر پوچھا..... "آپ لوگ کیا نوش کریں گے۔" ایسے موقعے پر ہم تکلف کرتے لیکن ہر شخص نے کچھ نہ کچھ لیا۔ بعض نے تو شراب تک طلب کر لی۔ ہم نے چائے پر گزارہ کیا۔

اب اصلی شو کا آغاز ہوا۔ مختصراً قالین سازی اور ترکی کے تذکرے کے بعد قالین دکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک قالین بچھایا جاتا اس کی تعریفیں ہوتیں اور قیمت۔ ایک چھوٹا سا قالین کھلا تو ہمارے خیال میں 500 روپے کا ہوگا۔ لیکن نیجر نے بتا کر حیران کر دیا کہ وہ چار سال میں بنایا گیا۔ بھلا چار سال ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر اس کی قیمت سنی تو پریشان ہو گئے۔ صرف 35 ہزار ڈالر کا تھا۔ اتنی رقم میں تو پاکستان میں خان بھائی سے لاکھوں قالین خریدے جا سکتے ہیں۔ نیجر کہہ رہا تھا۔ "جس لڑکی نے یہ قالین بنایا ہے اگر اس کی شادی چار سال پہلے ہو جاتی تو اسے گھر اور گزارہ دینا پڑتا۔ اس کی خواہشات پوری کرنی ہوتیں۔ اس حساب سے اس کی قیمت کچھ بھی نہیں ....." سوال یہ تھا کہ قالین خرید رہے ہیں یا لڑکی۔ اس رقم میں تو جس لڑکی نے بنایا اس جیسی درجن بھر لڑکیوں سے شادی خانہ آبادی کی جا سکتی ہے۔ نیجر یہ بات ہمارے سامنے کہہ رہا تھا۔ ہمارے بزرگ بادشاہ تھے ان کے حرم میں جو کنیزیں تھیں ان کا شمار قطار نہ تھا۔ 35 ہزار ڈالر کو ترکی کے لیرا میں ضرب دیں تو اتنی رقم بنتی ہے کہ گنتی ختم ہو جائے گی۔

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ قالین کا سائز بھی 4X6 تھا...... ہو سکتا ہے کوئی دل والا خرید لے۔ ہم وہ نہیں۔ پھر مراد نے ہدایت کی تھی۔ یہ لوگ مہنگا دیتے ہیں۔

دو آدمی قالین لاتے اور ہمارے سامنے کھولتے۔ ہر بار خیال ہوتا شاید کسی میں قلوپطرہ نکل آئے۔ فلم میں ایک منظر میں سیزر کے سامنے قلوپطرہ قالین میں لپٹ کر آئی تھی لیکن افسوس نہ وہ مصر تھا۔ نہ ہم شاہ وقت۔ ان لوگوں کے پاس کمسن معصوم لڑکیاں تھیں جو سر جھکائے کارخانوں میں کام کر رہی تھیں۔ صرف ان کا ذکر تھا۔

قالین بے حد حسین اور خوبصورت بعض ایسے کہ جی خوش ہو گیا لیکن مہنگے تھے۔ پھر مراد کی ہدایت یاد کر کے دل کو تسلی دیتے تھے۔

ایک قالین بچھا کر نیجر نے کہا ..."اس پر لیٹ کر سویا جا سکتا ہے" ایک سیاح بھاگ کر لیٹ گیا۔ آسٹریلیا کی زی بھی جا لیٹی۔ اسی وقت کارپٹ کارخانے والوں نے اس پر ایک کمبل

ڈالا اور تمام روشنیاں بند کر دیں۔ زی کی چیخ نکلی۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ روشنیاں کھولی گئیں تو کئی سیاحوں نے ان کی تصویریں اتار لیں۔

زندگی میں اتنے حسین قالین شاید پھر دیکھنے کو نہ ملیں۔ ظالموں نے شراب پیش کی۔ لیکن افسوس شباب کے بارے میں خاموش رہے۔ ترکی سیکولر ملک ہے۔

کارپٹ روم سے نکلے تو اس بار لڑکیوں کے پاس نہیں لے جایا گیا۔ بلکہ باہر کر دیا سڑک پر۔ دائیں طرف سفید برف سے ڈھکے پہاڑ تھے۔ ہر شخص اس پس منظر میں تصویریں کھنچوانے لگا۔

****

کے بعد بنائی گئی۔ اس کے دوطرف پہاڑ ہیں ان پر برف پڑی تھی۔ اسی گاؤں کی مناسبت سے روز لی گلابوں والی چائے بنائی جاتی ہے۔۔ چائے کا کیا ہے ..... وہ خوشبو چاہے اس میں ڈال لو...... وہی مہکنے لگے گی۔

کوچ کی آرام دہ سیٹ میں بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے پھر کھنڈر دیکھنے کا اعلان ہوا۔ کوچ ایک کونے میں روک دی گئی اور ہدایت ملی۔ سردی میں باہر نکلو سب اتر گئے تو کوچ روانہ ہوگئی۔ سامنے عجیب قسم کے اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ جن میں غار بنے تھے۔ مراد نے بتایا موسموں کا احتساب انہیں نقصان پہنچا رہا ہے اندازہ ہے کہ بیس سال بعد یہ گر جائیں گے۔ ہمیں افسوس ہونے لگا۔ ایسی کیا جلدی تھی بیس سال بعد آتے۔ تو یہ ڈھیر دیکھنے کی سعادت سے محفوظ رہتے ہمارے ساتھی بے چین ہوگئے۔ 20 سال بعد یہ گر جائیں گے اس کی حفاظت کے بارے میں سوال کرنے لگے۔ ہمارے ذہن میں جو تھا وہ پوچھ نہیں سکتے تھے کیا یہ ابھی ہمارے وہاں پہنچنے تک ڈھیر نہیں ہو سکتے؟ لیکن مراد کی کم نصیبی کہ یہ سوال وہ سن نہ سکا۔ کیمرے ان پہاڑوں کو فلم پر محفوظ کر رہے تھے مراد اتنی دیر میں ٹکٹ لے آیا دس لاکھ 30 ہزار لیرا ہر ایک۔ کے حوالے کیا۔ ہمیں تعجب ہو رہا تھا کہ اس قسم کے پہاڑوں اور غاروں کو دیکھنے کے لئے لیرا دینے پڑتے ہیں۔ ایسے تو ہمارے کوئٹہ کے راستے میں ڈھیروں ہیں جب چاہے دیکھ لیں ہم جس راستے پر جا رہے تھے اس کے دوسری طرف ہزاروں فٹ کی گہرائی تھی اور ڈر تھا ظالم کسی سیڑھی یا راستے سے نیچے نہ لے جائے۔ سیاحوں کے لئے سب سے اچھا ٹور وہ ہوتا ہے جس میں اس کا سانس باہر اور معلومات دماغ کے اندر ہو جائیں۔ یورپ اور امریکہ سے آنے والے سیاحوں کے لئے اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے کہ وہ چڑھنے اترنے۔ تصویریں کھینچنے اور بھاگ دوڑ میں مایوس نہ ہوں۔

خدا کا شکر مراد کا رخ ایک پہاڑ کی طرف ہوا۔ ہم سمجھے یہ اس کے پاس کھڑا ہو کر تاریخ کا کوئی بھولا بسرا صفحہ الٹے گا۔ لیکن وہ تو پہاڑ میں گھسنے لگا۔ اب جو دیکھا تو وہ غار تھا جس میں غائب ہو گیا اور اس کے پیچھے دوسرے سیاح اور ہم بھی ہمارے آگے اور پیچھے لوگ۔۔ غار میں اندھیرا۔ سر بھی جھکانا پڑتا تھا۔ اب نہ جانے یہ غار کتنا لمبا تھا۔ خدا کا نام لے کر قدم رکھتے رہے اور مراد پر غصہ کرتے رہے کہ ظالم نے کہاں لا مارا۔ اللہ بڑا کارساز ہے وہ غار ختم ہوا روشنی نظر

پہاڑ گرنے میں دیر

کوچ میں بیٹھے ہوں۔ موسم پسند کا ہو۔ دائیں بائیں کھیت کھلیان اور بستیاں گزر رہی ہوں تو سب اچھا لگتا ہے ترکی ایک بڑا ملک ہے۔ سارے موسم مل جاتے ہیں۔ بنجر زمین۔ لہلاتے کھیت۔ پہاڑوں پر زیتون کے ہرے درخت اور دور پہاڑوں پر سفید برف اور میٹھے پانی کی جھیلیں۔

ایک وادی نظر آئی۔ سرسبز درخت خوبصورت مکان اور اکا دکا سڑک پر چلتا آدمی یہاں سیب اگائے جاتے ہیں ترکی میں ایپل چائے مشہور ہے۔ زیادہ تر سیاح خرید کر لے جاتے ہیں۔ ترکی میں چائے کو چائے ہی کہتے ہیں۔ ہم نے سنا تو پہلی فرصت میں خرید لی۔ پھر ایک چھوٹا شہر آیا اس کا نام اسپارٹا تھا۔ اس جگہ گلاب اگائے جاتے ہیں۔ یہاں سلیمان ڈیمرل یونیورسٹی ہے۔ وزیراعظم سلیمان ڈیمرل اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔ یونیورسٹی میں نہیں۔ وہ تو ان

آئی۔ پہاڑ کے ساتھ راستہ سیڑھیاں اوپر چڑھتی تھیں دائیں طرف ریلنگ لگی تھی۔ اس طرف دیکھنے کا مطلب تھا۔ اپنی نظروں کو ہزاروں فٹ دور لے جانا جہاں ہوسکتا ہے تاریخ سے پہلے کے لوگ رہتے بستے ہوں۔

بائیں طرف اندھیرے کمرے تھے۔ ایک میں چند سیڑھیاں تھیں۔ مراد تو کھٹ کھٹ اتر گیا۔ سیاحوں کے ساتھ بار بار آتا ہے۔ سیڑھیاں اور پاؤں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ ہم ٹٹول کر اترے یہ سینٹ بابرہ کا چیپل ہے۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ لوگ اندر آئے تو اندھیرا بڑھ گیا اس میں نہ روشنی کرنے کی اجازت تھی نہ تصویر لے سکتے تھے۔ دیواروں پر حضرت عیسیٰ کو دکھایا گیا تھا۔ پھر ان کو مصلوب کرنے کا منظر۔ وہ آخری کھانا کھا رہے ہیں پھر وہ فرشتوں کے جھرمٹ میں ہیں۔ یہ چودھویں صدی میں بنائے گئے تھے۔ تصویریں اچھی تھیں اور سیاح حیران ہوکر دیکھ رہے تھے۔ اگر اندھیرے میں کچھ نظر آ رہا تھا تب ہم نے بہت کوشش کی اور کچھ نظر بھی آیا......

وہاں سے باہر نکلے تو تازہ ہوا اور روشنی دیکھی اور پھر سیڑھیاں اوپر ایک اور کمرہ سب لوگ اندر چلے گئے۔ ہم کمرے کے دروازے میں کھڑے رہے تو مراد نے آواز لگائی۔

''عباسی اندر آ جاؤ۔ آپ کے کھڑے ہونے سے روشنی رک گئی ہے۔''

ہم کمرے میں چلے گئے۔ یہاں بھی دیوار اور چھت پر تصویریں تھیں ان دنوں لوگوں کے پاس کام کاج تو ہوتا نہیں تھا اس لئے سارے وقت تصویریں بناتے رہتے تھے...... تاکہ بعد کو لوگ دیکھ کر حیران ہوں...... اس کمرے کے بعد پھر سیڑھیاں اور ایک مزید کمرہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے۔ اس بار ہم نے کمرے کے دروازے تک بھی جانے کی زحمت نہیں کی۔ اس لئے اندر جانے سے بچ گئے۔ اس جگہ مراد نے زیادہ دیر لگائی۔ بہرحال اسے نکلنا تھا اور وہ باہر آیا تو اوپر چڑھائی شروع ہوئی ایک راستہ بہت اوپر جا رہا تھا جہاں اور غار تھے ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ سیاح اوپر چڑھنے لگے۔ ایک بار مراد نے پلٹ کر دیکھا تو ہم نے ہاتھ ہلا دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ایک سیاح تو ہار گیا۔ ایک راستہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ چند لوگوں کو اس پر جاتے دیکھا۔

ہم نے سوچا واپس اسی جگہ چلتے ہیں- جہاں سے آئے تھے ان لوگوں کو آنا تو ادھر ہی

ہے۔ ایک خیال یہ آیا کہ اگر یہ اوپر سے ہی چلے گئے تو...... لیکن ایک گروپ پہاڑ کے سب سے اونچے غار سے نیچے آ رہا تھا اور وہ نیچے اتر کر اس طرف گیا۔ جہاں سے ہم آئے تھے۔ ابھی ہمارے ساتھی سیاح پہاڑ کی چوٹی کی طرف چڑھتے دکھائی دے رہے تھے اور وہاں بھی اس قسم کے چیپل ہوں گے۔ لیکن ان کا جذبۂ سیاحت سلامت رہے۔ ہم باز آئے اور آہستہ آہستہ اسی طرف آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ پہلے باتھ روم تلاش کیا دو لاکھ لیرا کے عوض گرم پانی سے ہاتھ دھوئے اور ایک ٹشو پایا۔ اس کے بعد اوپر جا کر دکانیں دیکھیں۔ ان میں کوئی کام کی چیز نہ تھی۔ ایک طرف چند سیڑھیاں اتر کر حکومت ترکی کا سیلز ڈپو تھا...... پوسٹ آفس اور ٹیلی فون کا نشان بھی بنا تھا۔ نیچے اترے تو ایک خوبصورت ڈسپلے سینٹر تھا۔ کارڈ فون بھی تھے۔ پہلے ان سے کھیلے پھر شیشے کا دروازہ کھول کر اندر گئے۔ تو چند خواتین سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

''آپ کی کیا خدمت کریں......''

ہم نے ایک لمحے میں چاروں طرف نظر ڈالی اور پوچھا۔

''ہمیں کوئی گڑیا مل سکتی ہے......''

''نہیں جناب ہمارے اسٹور میں گڑیا نہیں ہوتی......'' ایک نے معذرت کی اور افسردہ ہوگئی...... گڑیا سے مایوس ہوکر ہم نے پوچھا۔

''کیا ہم اسٹور دیکھ سکتے ہیں......''

''جی ضرور......'' وہ سامنے سے ہٹ گئیں۔

اسٹور میں وہ سارا سامان تھا جو کراچی کی کوآپریٹو مارکیٹ کی صرف ایک دکان سے مل سکتا ہے۔ ترکی ایک غریب ملک ہے۔ گڑیا تک نہیں بناتا۔ کہنے کو F-16 اسمبل کرتا ہے۔ مرسڈیز کے پرزے جوڑ کر گاڑی تیار کر لیتا ہے لیکن اگر ایک گڑیا بنا لیتے تو ہم پہاڑوں غاروں کے درمیان خرید لیتے اور اصل گڑیا افسردہ نہ ہوتیں۔

اسٹور صاف ستھرا اور گرم تھا۔ لیکن زیادہ دیر یہاں رک کر ساتھیوں کو کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے باہر آئے تو دیکھا وہ لوگ دور پہاڑ سے اتر رہے ہیں۔ ہم انہیں دیکھا کئے......

ذرا دیر میں یہ سب ہمارے ساتھ تھے اور آج پہلی بار کسی کے منہ سے ''ویری گڈ...

ویری نائس" سنائی نہیں دیا۔

کوچ کئی فرلانگ دور پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ مراد نے ایک بار ہاتھ ہلایا۔ دو بار سیٹی بجائی اور پھر سب چل پڑے۔ راستہ ڈھلوان تھا۔ صرف ہم تر و تازہ تھے آگے جا کر سیڑھیاں تھیں۔ ہم نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو سیلیا نے ہمارا بازو تھام لیا۔

"شکریہ... آپ کے ہاتھ کا سہارا منزل آسان کر دیتا ہے......" ہم نے کہا۔

"میں تو بہت تھک گئی ہوں۔ آپ نے اچھا کیا اوپر نہیں گئے......" سیلیا بولی۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ایک بازار آ گیا۔ دونوں طرف دکانیں اور گھات لگائے دکاندار۔ وہاں آئیڈیا مل گئیں۔ وہ چپیل دیکھنے نہیں گئی تھیں لیکن اس بازار میں اپنی بیٹی اور اس کی بیٹی کے لئے شاپنگ کر رہی تھی اور اب چیزیں دکھا کر داد و تحسین وصول کر رہی تھی۔

سب کوچ میں بیٹھے تو پہلی بار ہم نے اپنے ساتھیوں کے چہروں پر اطمینان و سکون دیکھا جیسے ایک لمبی مسافت کے بعد ہو۔

مولانا رومیؒ کے مزار پر موئے مبارکؐ

ہم نے جب ہوش سنبھالا مثنوی مولانا روم سنی۔

ریڈیو پاکستان میں ملازمت کی۔ کراچی میں تعینات ہوئے تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ شیروانی پہنے صاف ستھرے نفیس سے آدمی۔ وہ مثنوی مولانا رومیؒ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اس حد تک عاشق مثنوی تھے کہ گھر کا نام بھی اسی پر رکھا۔ پاکستان کی آوازوں کی دنیا میں شاہ بلیغ الدین، احتشام الحق تھانوی اور مولانا سلیم الدین شمسی کو سن کر مذہبی ماحول کا احساس ہوتا تھا۔ ہم اس صدی کے آخری سال میں کراچی ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر بنے تو مولانا سلیم الدین شمسی مثنوی رومی کے ساتھ آ گئے۔ یہ پروگرام جمعہ کی شب شروع ہوا۔ یہ مثنوی فارسی میں ہے جن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی وہ بھی عقیدت اور احترام سے سنتے ہیں۔

آج ہم "کونیا" میں تھے ترکی کے سب سے اہم علاقے میں۔ جہاں مثنوی کے خالق

مولانا جلال الدین رومیؒ سوتے ہیں۔ ہمارے ہوٹل کے بالکل سامنے اگر کمرہ سڑک کے رخ ہوتا تو ان کے مزار کا گنبد کھڑکی سے نظر آتا۔ کونیا آ کر اور جلال الدین رومیؒ کے اتنے نزدیک ہو کر سفر کا لطف دوبالا ہو گیا۔ ہمارے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس سفر میں یہ سعادت حاصل ہوگی۔

صبح ناشتے کے بعد ہوٹل سے نکلے۔ ایک سڑک پار کی۔ فٹ پاتھ پر چلے اور ایک بڑے احاطے کے سامنے پہنچ گئے۔ ایک بڑا گیٹ تھا۔ دائیں طرف کھڑکی تھی۔ وہاں سے ٹکٹ خریدنا تھا۔ مزار کو مولانا میوزیم کہتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ترکی میں حکومت لامذہب ہے۔ اندر جانے کے لئے ٹکٹ خود لینا تھا یہ ٹور میں شامل نہیں تھا۔ ہم نے کھڑکی کے سامنے پہنچ کر بہت سے نوٹ وہاں بیٹھے شخص کے سامنے کر دیئے۔ اس نے پسند کے اٹھالئے 20 لاکھ لیرا تھے۔ ہمارے خیال میں بہت کم تھے۔

ایک بڑا دالان درمیان میں ایک گول چھوٹی عمارت، شاید کسی زمانے میں پانی کے لئے ہو۔ مراد کو اس کا علم نہیں تھا۔ ترکی میں لامذہب حکومت ہے اور تمام نوجوان اس کے حامی ہیں۔

دو سیڑھیوں کے بعد دروازہ تھا۔ جوتے اتار کر وہاں رکھی پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالے اور مراد سے کہا۔ ”مولانا کا مزار دکھا دینا ...“

”ضرور“ وہ بولا۔

لکڑی کے دروازے پر قرآنی آیتیں تحریر تھیں..... اندر دونوں طرف مزار تھے درمیان میں مولانا رومی سو رہے تھے...... ہر طرف سنہرا رنگ تھا۔ چاروں طرف دیواروں پر قرآنی آیتیں، عورتیں مرد بچے کھڑے تھے۔ سرہانے ایک بڑا صافہ بندھا تھا۔

مراد نے کہا ”یہ مولانا صاحب کی قبر ہے......“

ہم نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھالیے۔

مولانا جلال الدین رومی 30 ستمبر 1207ء کو افغانستان کے شہر بلخ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا بہاؤ الدین اپنے زمانے کے عالم مانے جاتے تھے اور ایک بڑے پائے کے استاد تھے۔ حکومت وقت سے ناراض ہو کر افغانستان سے ہجرت کر کے نیشاپور بغداد مکہ مکرمہ اور پھر ترکی کے شہر کونیا پہنچے۔ مولانا بہاؤ الدین جب نیشاپور میں تھے۔ ممتاز عالم دین شیخ فرید الدین

عطار نے مولانا جلال الدین رومی کو پڑھانے کی تلقین کی تھی۔ اس وقت مولانا رومی بچے تھے۔

مولانا بہاؤ الدین رومی کونیا پہنچے ان کی علمیت کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ عثمانی خلفاء نے اس علاقے میں ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا اور بہاؤ الدین رومی کو اس کا سربراہ بنایا۔ جہاں انہوں نے عرصے تک دین کی تعلیم دی اور جلال الدین رومی بھی مستفید ہوئے۔ بہاؤ الدین رومی کے انتقال کے بعد جلال الدین رومی نے مدرسے کا انتظام سنبھالا۔ ان کی ملاقات شمس الدین تبریزی سے ہوئی اور مولانا رومی کو ان سے ایسی عقیدت ہوئی کہ اپنے دیوان کا نام دیوان شمس تبریزی رکھا اس کے علاوہ ان کی مثنوی ایک عالم میں مقبول ہوئی۔ ان کا ایک دیوان رباعیات کا ہے جس میں مولانا نے اپنا تخلص شمس رکھا ہے۔ اس دیوان میں دو ہزار رباعیات ملتی ہیں اس میں دینی اور دنیاوی مسائل پر اظہار خیال خوبصورتی سے کیا ہے عام قاری انہیں پسند کرتا ہے۔

مثنوی ان کا بڑا کارنامہ ہے اسے مکمل کرنے میں 42 سال لگے۔ اس میں 26 ہزار اشعار ہیں۔ یہ معرفت، اسرار دین اور بیش بہا علم کا خزانہ ہے۔ مثنوی میں روزمرہ کی وہ تمام باتیں شامل ہیں جن میں علم کی اہمیت اور طریقہ علم کا انداز بتایا گیا ہے۔ ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں۔

”علم ایک پھیلا ہوا موجیں مارتا سمندر ہے اور طالب علم اس میں غوطہ زن رہتا ہے۔ طالب علم ہزاروں سال زندہ رہے تب بھی وہ اس سمندر سے باہر نکلنا پسند نہیں کرے گا۔“

مولانا دو قسم کے علم پر اظہار کرتے ہیں ایک جس سے روزگار کماتا ہے۔ دوسرا تحقیق جو اصل علم ہے۔ جس میں جستجو، تلاش ہوتی ہے جو اسے سچی راحت دیتی ہے۔ مولانا کا فلسفہ تھا کہ انسان اپنی کوشش سے کائنات فتح کر سکتا ہے۔“

مولانا جلال الدین رومی سے علامہ اقبال بے حد متاثر تھے۔ اپنے صاحبزادے کو ”جاوید نامہ“ میں پیر رومی کی پیروی کرنے کی تلقین کی ہے۔ علامہ نے قوم کے افراد کو مولانا رومی کو رہنما بنا کر محنت کرنے کی ہدایت کی ہے۔

سینکڑوں سال گزرنے کے بعد بھی مولانا رومی کی تعلیمات آج بھی تازہ ہیں۔ ہم ان کے حضور کھڑے تھے۔ ان کی مذہبی خدمات اور شاعری ناقابل فراموش ہے، ایران، ہندوستان،

پاکستان میں ان کے کروڑوں عقیدت مند ہیں۔

مراد کو کیمرہ دے کر ایک تصویر کھنچوائی۔ دوسری دل کے اندر اتاری۔ یہاں ان کے بعض شاگردوں اور عزیزوں کی قبریں بھی موجود ہیں۔ نومبر کے مہینے میں ان کا عرس منایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر "رقص درویش" بھی ہوتا ہے یہ حیرت انگیز منظر ہوتا ہے۔ اوپر سے نیچے تک ایک مخصوص چوغا نما لباس اور ٹوپی پہن کر درویش گھنٹوں گول گول گھومتے اور ان کے فارسی کلام پر سر دھنتے ہیں۔ اسے دیکھنے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ مراد کا کہنا ہے۔ "یہ اب نہیں ہوتا۔" وہ ٹھیک کہتا ہوگا ہم نے اس کی ویڈیو فلم دیکھی ہے۔ ترکی میں اس کی اجازت نہیں۔ وہاں سیکولر حکومت ہے۔

تمام قبروں کے سرہانے صافے بندھے تھے۔ جو اچھے لگ رہے تھے اور ہمارے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اس سے ان کی عظمت اور شان نظر آتی تھی۔ مولانا رومی کے آگے عقیدت مند کھڑے تھے۔ دو عورتیں فرش پر بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ لوگ آتے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھاتے۔ لکڑی کی ریلنگ کو ہاتھ لگاتے اور چند لمحے تعظیم میں کھڑے رہتے۔

مزار کے سامنے ایک ہال تھا۔ جس میں قرآن کریم کے مختلف نمونے رکھے تھے۔ کیا خوبصورت کتابت تھی۔ یہ پرانے نسخے تھے۔ ان کی تاریخ تھی برسوں سے سیاحوں کو حیران کر رہے تھے اور پھر ایک ایسی چیز جو دنیا کے سارے خزانوں سے زیادہ قیمتی تھی دوسرے ہال کے بیچوں بیچ چاندی کے ایک بند برتن میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے بال رکھے تھے۔ ہم عقیدت سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ موئے مبارک تو نظر نہیں آئے لیکن تصور کی آنکھ نے دیکھ لئے۔ دل بھر آیا...... اپنی صحت اور کامرانی کی دعا مانگنے لگے۔ اپنے رب سے۔ اس ذریعے اور طفیل میں اپنے بے شمار خزانوں سے ایک ذرہ سمندروں سے ایک قطرہ ہمیں بھی دے اور گناہوں کو معاف کر۔ تیرے رحم کے طلب گار ہیں یہاں کھڑے ہو کر سکون آیا۔ مولانا رومی کیسے مقدر والے ہیں کہ ان کا آستانہ رسالت مآب سرور کونینؐ کے موئے مبارک سے روشن ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی پر کرم کرتا ہے تو بے شمار عنایتیں کرتا ہے۔

ہم مزار سے نکلے تو دل مطمئن تھا۔ ترکی آنے کا مقصد پورا ہوا۔ ایک دربار میں حاضری ہوئی۔

کاروان سرائے بغیر کاروان

ایک سیدھے سادھے آدمی نے کسی مسافر کو کھانا کھلایا۔ رات کو آرام دہ بستر دیا۔ صبح ناشتے پر دودھ شہد اور انڈے کھلائے اور پھر گاؤں کے کنویں میں ڈال دیا۔ اس میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ مسافر زخمی ہوا لیکن بچ گیا۔ کسی طرح باہر نکلا تو قاضی سے شکایت کی۔ اس نے جب سیدھے سادھے آدمی کو بلایا۔ تو وہ بولا۔ "میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا نیکی کر کنویں میں ڈال" اس لئے مسافر کے ساتھ نیکی کی اور اُسے کنویں میں ڈال دیا...... وہ دن ہے...... اور آج کا بزرگوں نے کہا "نیک کام کرنا ہے تو پل بناؤ۔ کنویں کھدواؤ اور سرائے تعمیر کرو......" اس پر عام آدمی سے بادشاہ تک نے عمل کیا۔ جگہ جگہ کنویں کھد گئے پل بن گئے...... اور سرائے تعمیر ہوئیں۔ ترکی میں بھی نیک کام ہوتے تھے۔ اس لئے سرائے بنائی گئیں...... اور آج ہم ایک کاروان سرائے دیکھنے جا رہے تھے۔ یہ کپاڈوکیہ کا علاقہ ہے۔ جہاں خوبصورت گھوڑے پیدا

ہوتے ہیں اور آلو کی کاشت ہوتی ہے۔ ہمیں آلو اور گھوڑوں کے درمیان کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی۔ لیکن کپاڈوکیہ والے آزاد ملک کے رہنے والے ہیں جو چاہیں اگالیں۔ بتالیں۔ گھاس کے میدان نظر آئے۔ یہ تو چراہ گاہ ہوئیں۔ پہلے زمانے میں جنگلوں میں گھوڑے بڑا کام کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں تو تانگہ کھینچتے ہیں، ترکی میں ایک گدھا نظر آیا تھا جو گاڑی میں بندھا تھا۔ گھوڑے کے موجودہ کام کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

سڑک کے کنارے ایک عمارت کے سامنے کوچ روک دی گئی۔ پتھر کی بنی یہ عمارت چھوٹا سا قلعہ معلوم ہوتی تھی۔ ..... مضبوط پتھروں سے تعمیر تھی۔ بڑے دروازے کے آگے بورڈ لگا تھا۔ ''ازاکاران سرائے'' ..... یہ اس کاروان سرائے کا نام تھا۔ چٹانوں سے تعمیر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو دونوں طرف دکانیں تھیں۔ یہ سرائے اللہ دین نام کے ایک رئیس آدمی نے 12 ویں صدی میں تعمیر کرائی تھی۔

دروازے کے آگے کھلا میدان تھا۔ درمیان میں ایک عمارت تھی یہ مسجد تھی۔ چاروں طرف کمرے بنے تھے۔ جن کی چھتیں بہت اونچی تھیں... بائیں طرف جو کمرے تھے وہ بے حد بڑے اور چھتیں بہت بلند تھیں۔ مراد نے بتایا اس میں مسافروں کے اونٹ باندھے جاتے تھے۔ اس قسم کی سرائے میں مسافر ایک دن مفت قیام کر سکتے تھے۔ ان کے کھانے اور رہنے کا سارا خرچ حکومت برداشت کرتی تھی۔

کسی نے پوچھا ... ''اور دوسرے دن ...''

''ادائیگی کرنی پڑتی تھی .. مراد نے بتایا۔

اس کی تو وہ مثال ہوئی کہ ''ایک دن مہمان دوسرے دن بلائے جان۔''

ہر سرائے اس طرح بنائی جاتی کہ جب کاروان یا مسافر کے سفر کے دوران رات آئے تو ایک سرائے مل جائے۔ یہ اونٹ کی رفتار ناپ کر تعمیر کی جاتی تھیں عام طور سے ہر بارہ گھنٹے کی مسافت پر ایک کاروان سرائے ہوتی تھی مسافر صبح کی نماز پڑھ کر سفر کا آغاز کرتے اور عموماً مغرب کی نماز کسی دوسرے سرائے میں پڑھتے۔ یہ قافلہ اونٹوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

کاروان سرائے میں مسافروں کے آرام کا خیال رکھا جاتا تھا..... مراد معلومات دے کر

ایک بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ سیاح کمروں میں گھس گئے۔ اندھیرے۔ سیلن سے بھرے ہوئے بڑے بڑے کمرے۔ پتھروں کی دیواریں۔ فرش پر ریت۔ لیکن موسموں کی دسترس سے محفوظ یہی وہ جگہ تھی جہاں پالا گراتی سردی اور برف برساتی ہوا میں آگ کے گرد مسافر بیٹھ کر قصے کہانیاں سنتے سناتے ہوں گے۔ پھر کوئی زخمی دل رباب بجاتا ہوگا اور کہیں گھنگھروؤں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہوں گی۔ کاروان سرائے رومانی داستانوں کا ایک کردار ہے۔ آج ایک ایسی ہی سرائے میں ہم کھڑے تھے۔ یہ بے جان پتھر کی دیواریں چپ تھیں 800 سال کی کہانیاں اس کے وجود میں چھپی ہوں گی۔ یہ چھت سب دیکھتی ہوگی... یہ فرش کیسے مضبوط اور حسین قدموں کی دھمک سے محظوظ ہوا ہوگا۔ لیکن اب کیا ہے۔ ان دیواروں کے درمیان چینی بولتی۔ بیٹھی ہوئی ناک کی لڑکی اپنے ساتھی سے تصویر بنوانے کی فرمائش کر رہی ہے۔ اجنبی زبان بولتے دو مرد گزر رہے ہیں۔

ہر کمرے آگے سے روشن اور اندر تاریک ہیں۔ 12 ویں صدی میں یہاں مشعلیں روشن ہوئی ہوں گی اور آج وہ بجھ چکی ہیں۔

دنیا بھر کے سیاح ماضی میں جھانکنے آتے ہیں۔

آئیڈیا تصویریں بنا رہی تھی۔ کلے دیواروں کو چھو کر دیکھ رہی تھی اور صالح میدان میں پریشان کھڑا تھا۔

''عباسی درمیان میں تو دیواریں اور ریت ہے مسجد کہاں ہے...''

''اوپر کی منزل میں۔'' ہمارے منہ سے اچانک نکل گیا۔

اوپر جانے کے لئے پتھر کی سیڑھیاں تھیں ایک طرف دیوار اور دوسری طرف کوئی ریلنگ نہیں تھی۔ صالح کا جذبۂ ایمانی جوش میں تھا۔ رمضان تھا اس نے ہمیں دعوت دی...

''عباسی اوپر چلتے ہیں.....''

''تم جاؤ اپنا کیمرہ دے جاؤ۔ ہم تصویر بنائیں گے.....''

مطلب تھا تم گرو تو کم از کم کیمرہ تو محفوظ رہے۔ صالح نے سوچے بغیر سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ بارہویں صدی میں جو لوگ اونٹ پر سواری کرتے اور پہاڑوں میں سفر کرتے تھے۔ ان کے اور صالح کے درمیان کچھ فرق ہونا چاہئے۔ چار سیڑھیوں کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ غلطی کر گیا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ لوٹنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کیونکہ صالح کے پیچھے دو

اور باؤلے سیاح سیڑھیاں چڑھنے لگے تھے۔ وہ اوپر جانے لگا اور ہم ہر بار اسے نیچے گرتے دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اوپر والے کمرے میں پہنچ گیا اور چیخ کر بولا۔

"تم ٹھیک کہتے تھے۔ عباسی۔ اوپر مسجد ہے...... آ جاؤ...."

ہم نے کہا......

"تم دیکھ لو...... اور سیدھے کھڑے ہو تمہاری تصویر اتارتے ہیں۔"

وہ سیدھا کھڑا ہوا...... اس عرصے میں دو چار سیاح اور سیڑھیاں چڑھنے لگے......

صالح نے کہا۔" عباسی نیچے سے لوگوں کو روکو میں اترنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں اترنا چاہتے ہو......" ہم نے پوچھا۔ ہمارا مطلب تھا اب اوپر ہی رہو یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ دیواروں پر ہاتھ رکھ کر اترنے لگا۔ جو سیاح اوپر چڑھ رہے تھے رک گئے۔ صالح نے اترنے میں خاصی دیر لگائی۔ شاید چڑھنے سے زیادہ اترنا مشکل تھا۔ وہ نیچے آیا تو اِدھر اُدھر فخر سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے ہمالیہ کی چوٹی سر کر کے آیا ہے لیکن افسوس کسی نے اس کارنامے پر کوئی سوال نہیں پوچھا یہاں تک ہم نے بھی نہیں...... وہ خود ہی بتا رہا تھا۔

"اوپر مسجد ہے...... لیکن دیکھ بھال نہیں کی گئی ہے ....."

ہماری دیکھ بھال کرنے والے مراد نے ہانک لگائی۔

"چلو کوچ میں ٹیھوئی منزل کی طرف روانگی ہے......"

دیہات الگ، شہر جدا

خدا جھوٹ نہ بلوائے جتنا کھیرا اور دہی ہم نے ترکی میں کھایا زندگی بھر نہ کوئی کھا سکتا ہے نہ کھا سکتے ہیں۔ ناشتے میں دوپہر کے کھانے اور رات کو ڈنر میں۔ ٹماٹر بھی ڈھیروں ہوتے لیکن ہم نے انہیں کبھی منہ نہیں لگایا سوائے کیچ اپ کے جسے ترکی میں ٹٹ کیچ اپ کہتے ہیں۔ لسی ترکی میں قومی مشروب ہے اس حد تک کہ اکثر رات کو کھانے میں گرم لسی پر زیتون کا بگھار ملا۔ اسے یوگرٹ سوپ کا نام دیا گیا۔ ہم امریکہ سے گئے تھے جہاں دہی بدمزہ ہوتا ہے اس لئے ترکی میں خوب کھایا۔ بس حیرت رہی تو نارنگی کا رس پینے کی...... ایک دو بار ملا بھی تو ٹن کا۔ بے مزہ.....

دوپہر کو کھانا اپنے لیرے خرچ کر کے کھانا ہوتا اس لئے ذرا کفایت شعاری کرتے۔ ہماری ساتھی خواتین اکثر صبح کے ناشتے سے چند اشیا دوپہر کے لئے اٹھا لیتیں اور جب ہماری نظر

اس کارروائی پر پڑ جاتی تو درغلاتیں دو ایک ابلے انڈے اور پنیر پیش کرتیں لیکن ہم اپنے کردار گفتار اور عمل صالح سے ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ایک سچے مسلمان ہیں اور اس کے نتیجے میں بیس تیس لاکھ لیرا کے عوض ایک مچھلی کا ٹکڑا یا شیش کباب حاصل کر پاتے۔ دو ڈھائی لاکھ میں پانی کی بوتل خریدتے۔ یہ بات نوٹ کر لی جائے اور بوقت ضرورت دہرائی جائے۔ آج دوپہر جس ریسٹورنٹ میں لنچ تھا وہاں ٹراؤٹ فش تھی۔ اس پر توجہ دی ایک چھوٹی بوتل پانی بھی منگالیا۔ وہاں بار بار ڈرم پر چوٹ پڑنے کی آواز سنائی دی دیکھا تو ایک موٹا ہرے رنگ کا طوطا اپنی چونچ سے ڈرم بجا رہا تھا۔ یہ منظر اچھا لگا سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ طوطے نے اب ذرا اکڑ اکڑ کر ڈرم پیٹنا شروع کر دیا۔ آسٹریلیا والی لڑکیاں نزدیک چلی گئیں۔ اُسے ڈبل روٹی ڈالی۔ لیکن وہ تو شاید پستہ بادام کھانے والا طوطا تھا اس لئے اس طرف متوجہ نہ ہوا۔

ہم طوطا دیکھ رہے تھے تو میز کے دونوں طرف لوگ بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے ڈبل روٹی کے ٹکڑے رکھ دیئے گئے۔ ہم نے سوچا الگ میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہوٹل کے بیرے نے ایک پلاسٹک کے برتن میں چار چھ ڈبل روٹی کے ٹکڑے لا رکھے۔ ہم نے نوش کئے۔ اور بل میں دس لاکھ لیرا زیادہ لگ کر آئے پوچھا...... تو معلوم ہوا اگر ہم سب کے ساتھ بیٹھتے تو مفت، الگ بیٹھے اس لئے دس لاکھ لیرا دینے پڑے۔ آئندہ جس طرح بھی بن پڑا سب کے ساتھ بیٹھے، اتفاق میں "بچت" ہے......

اس ہوٹل میں سبزیاں اور پھل رکھے تھے۔ سجاوٹ کے لئے۔ شاید برسوں پرانے باہر کوریڈور میں کرسیاں رکھی تھیں۔ جہاں بیٹھ کر مراد سگریٹ پی رہا تھا اور ای ڈی، ٹے اور کلے کو دکھانے کے لئے تیز دوڑ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا اس کی توند باہر نکل رہی ہے ریسٹورنٹ سے باہر رہ کر وہ اپنے لیرے بچا رہا تھا اور بھاگ کر سردی سے بھی بچت کر رہا تھا۔

فضا میں سردی تھی۔ ذرا دیر پہلے بارش ہو چکی تھی۔ درخت دھل کر گہرے سبز ہو گئے تھے۔

کوچ روانہ ہوئی تو دونوں طرف پہاڑ شروع ہو گئے۔ ان میں دیہات تھے مراد نے بتایا۔ اگر کوئی مسافر دیہات میں کسی گھر کا دروازہ کھٹکا کر کہے .. "میں اللہ کا مہمان ہوں تو اہل خانہ اسے کھانا دیں گے۔ خاطر تواضع کریں گے ...."

آئیڈیا نے حیران ہو کر پوچھا...... "واقعی۔" صبح کے وقت وہ سب سے زیادہ انڈے ڈبل روٹی اُٹھاتی تھی۔ ہم نے اسے بتایا۔ "ہمارے ملک میں تو پیسے بھی دیتے ہیں بس صرف اتنا کہنا پڑتا ہے..... "اللہ کے نام پر بابا"

دیہاتی اور شہری زندگی میں بڑا فرق ہے۔ شہر لامذہب ہیں اور دیہات خالص اسلامی اسی لئے مراد سڑک پر کھانے سے احتیاط کی تاکید کرتا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ دیہاتی روزہ رکھتے ہیں۔

ترکی کے دیہاتوں میں انگور اور انجیر کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہزل نٹ بھی دنیا میں سب سے زیادہ اگائے جاتے ہیں۔

ایک دیہات کے نزدیک فوجیوں کو دیکھا۔ وہ بندوقیں لئے کھڑے ہیں۔ مراد کی نظر بھی اس طرف چلی گئی۔ اس نے بتایا ترکی میں جس علاقے کی آبادی 20 ہزار ہوتی ہے۔ وہاں پولیس کا کام فوجی انجام دیتے ہیں یہ حیرت انگیز بات ہے۔ دنیا بھر کے جمہوری ملک کوشش کرتے ہیں کہ فوجی اپنی بیرکوں میں رہیں۔ کم از کم معاشرے کا ایک طبقہ تو شہری برائیوں سے بچا رہے۔ لوگوں کا اعتماد ہے کہ فوجی ایماندار، دیانتدار، محنتی اور اصول پرست ہوتے ہیں ہم بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر ہمیں آبادی سے دور عام زندگی سے فاصلے پر رکھا جائے، انکم ٹیکس، کسٹم، پولیس کی دسترس سے محفوظ کیا جائے۔ پہننے کے لئے وردی اور کھانے کے لئے بہترین لنگر کا انتظام ہو تو قسم ہے جو ہم رشوت لیں۔ جھوٹ بولیں، افواہ اڑائیں، بات موقع ملنے اور اس کو قبول کرنے کی ہے۔ جمہوریت کے لئے فوج کو اپنی بیرک میں رہنا ضروری ہے۔

ترکی میں فوجی تربیت ضروری ہے۔ جہاں کوئی 20 سال کا ہوا 18 ماہ کی ٹریننگ کے لئے بلا لیا گیا۔ تعلیم کے دوران یہ تربیت ایک دو سال بعد ہوتی ہے۔ ترکی کے شہری اگر ملک سے باہر بھی ہوں تو انہیں اس سے چھوٹ نہیں ورنہ شہریت منسوخ۔ ٹریننگ کے دوران کھانا وردی مفت اوپر سے ساڑھے آٹھ امریکی ڈالر کے مساوی لیرا۔ جاؤ عیش کرو... خواتین کے لئے رضاکارانہ ہے۔

کسی نے پوچھا ... "یہ ٹریننگ کیوں ہوتی ہے......"

مراد نے بتایا۔ "ترکی کے چاروں طرف دشمن ہے۔ اپنی حفاظت کے لئے یہ ٹریننگ

ضروری ہے۔''

ترکی کے ہمسائے، ایران، شام اور عراق ہیں۔ باقی کا کیا شمار قطار ہم جب سفر میں ہوتے ہیں سیاست اور مذہب پر گفتگو نہیں کرتے اس لئے چپ رہے اور مراد بھی خاموش رہا۔۔۔

ملانصیرالدین

کسی نے صبح کے وقت دروازہ کھٹکھٹایا۔ صاحب خانہ نے دروازہ کھولا تو دیکھا اس کے ایک عزیز دوست کھڑے ہیں۔

''خیریت تو ہے اتنی صبح......''

''میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں''...... دوست نے کہا۔

''ہاں بے تکلف کہو . میرے لائق کیا خدمت ہے......''

''مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں تمہارا گدھا ایک دن کے لئے چاہئے. ..''

صاحب خانہ سوچ میں پڑ گئے.... دوست نے دیکھا تو پوچھا۔

''کیا ہوا۔ آپ پریشان کیوں ہو گئے. ..''

''بات یہ ہے کہ رات ہی میرا ایک دوست گدھا مانگ کر لے گیا ہے . . شرمندہ ہو رہا

ہوں آپ کو کیا جواب دوں......"

"کوئی بات نہیں میں کسی اور سے لے لوں گا......" دوست نے کہا۔

اچانک گھر کے اندر سے گدھے کے بولنے کی آواز آئی۔ دوست چونک گیا اور کہا۔

"بہت افسوس کی بات ہے آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ گدھا اندر ہے اور آپ کہہ رہے ہیں۔ کسی دوست کو دے دیا ہے......"

صاحب خانہ نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس تو اس بات پر ہے کہ آپ نے میری بات پر یقین نہیں کیا بلکہ گدھے کی آواز پر بھروسہ کیا......"

صاحب خانہ ملا نصیر الدین ہیں۔ یہ ہندوستان، پاکستان، ایران اور ترکی کے مشہور کردار ہیں ان کے قصے ان کی حکایتیں لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ لوگ انہیں پسند کرتے ہیں ایک بار ایک شخص نے ملا نصیر الدین کے دروازے پر دستک دی اور کہا۔

"سنا ہے۔ آپ کے پاس چالیس سالہ پرانا سرکہ ہے......"

"جی ہے"

"تھوڑا سا مجھے دے دیجیے......"

"اگر یہ سرکہ دیتا رہتا تو 40 سال پرانا کیسے ہوتا"

ہم نے ترکی پہنچ کر مراد سے ان کے بارے میں پوچھا...... ملا نصیر الدین ترکی ہیں۔ "نصیر الدین ہڈا جا" کہلاتے ہیں۔ ان پر کئی کتابیں ملتی ہیں۔ کوچ میں مراد نے ایک کتاب دکھائی۔

ملا نصیر الدین 13 ویں صدی میں ترکی کے اناطولیہ کے علاقے میں پیدا ہوئے تھے یہ ایک غریب آدمی تھے۔ گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ ان کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں ایک میں بتایا گیا ہے کہ یہ اسکول میں پڑھاتے تھے۔ دوسرے میں تحریر ہے کہ کچھ عرصے وہ کسی مسجد کے امام بھی رہے۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاتا۔ ان کے قصوں کی کتابیں ملتی ہیں۔

13 ویں صدی میں ترکی میں حالات مختلف تھے۔ لوگ انتظامیہ سے نالاں تھے۔ ایسے موقعے پر ملا نصیر الدین کی کہانیاں لوگوں کو سکون پہنچاتی تھیں۔ ان میں انتظامیہ پر طنز بھی ہوتا تھا۔ جب کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تو طنز و مزاح سے بھرپور قصے کہانیاں اور شعر بھی لوگوں کی

بھڑاس نکالتے ہیں۔

ترکی والوں کا خیال ہے۔ ہر دور میں ایک ملا نصیر الدین کی ضرورت ہوتی ہے جو حالات پر طنز کر سکے اور لوگوں کو صحیح سمت لے جانے کی کوشش کرے۔ ملا نصیر الدین نے یہ کام سرانجام دیا۔ دکانوں پر ایک گدھا ملتا ہے جس کی دم کی طرف منہ کیے ملا نصیر الدین بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ان کی سفید داڑھی ہے۔ لمبا چوغا پہنے ہوئے ہیں۔ سیاح خوش ہو کر خریدتے ہیں۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کی قبر پر نہ جا سکے۔ مراد نے بتایا وہ سینٹرل اناطولیہ۔ اکسر یا کونیا میں کسی جگہ دفن ہیں۔ ایک بار ایک سیاح ان کی قبر پر گیا تھا۔ ترکی والے چاہیں تو اسے بھی دریافت کر کے سیاحوں کی کشش کا سبب بنا سکتے ہیں۔ ابھی ان کا خیال اس طرف نہیں گیا اور ملا نصیر الدین صرف کتاب میں زندہ ہیں۔

....

سرد موسم، ٹھنڈا ہوٹل

کوچ شہر سے باہر نکلی تو مراد نے کہا۔ ''ہم اس ہوٹل کی طرف جا رہے ہیں جو مجھے بے حد پسند ہے۔ انتہائی نفیس، خدمت میں اعلیٰ، کھانے میں لاجواب، جو ایک بار قیام کرتا ہے۔ بار بار آنے کی خواہش کرتا ہے۔ جو یہاں آتا ہے خوش ہوتا ہے۔'' ہم کپاڈوسیا کے علاقے میں تھے اور ہوٹل کا نام ارماک تھا یہ ابونوس میں تھا جسے ہولی ڈے ریزورٹ کہتے ہیں۔ یعنی چھٹیاں گزارنے کا ہوٹل اسے دریا کے کنارے والا ہوٹل بھی کہا جاتا ہے یہ دریا کے کنارے واقع ہے۔ اس بیان کے بعد ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ دوسرے ہوٹلوں کی طرح بیابان میں ہوگا۔ آبادی اور دکانداری سے رابطہ منقطع رہے گا۔ ہم سے زیادہ خواتین پریشان ہونے لگیں۔ مشرقی عورت کی طرح ان کے خون میں بھی شاپنگ کے بیکٹریا شامل ہوتے ہیں۔

ہماری توقع کے عین مطابق ویرانہ شروع ہوا اور پھر ایک عمارت کے آثار۔ یہ ہوٹل تھا۔

خاصہ بڑا۔ کئی منزلہ۔ صاف ستھرا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک بیرا ویلکم ڈرنک سیاحوں کو پیش کر رہا تھا۔ ہماری طرف بھی بڑھا...... ہم نے پوچھا ... ''کیا ہے ......''

''خوبانی کا جوس......''

ہم نے ایک گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں تک لے جانے سے پہلے اچانک آئیڈیا کی طرف نظر اٹھ گئی۔ وہ دوسرا گلاس اٹھا رہی تھی اور اپنے برابر کھڑی سیلیا سے کچھ کہہ رہی تھی...... ہماری چھٹی حس بیدار ہوئی۔ اس میں کچھ گڑ بڑ ہے......

ہم نے بیرے سے پوچھا۔

''اس میں کیا ہے......''

''سفید شراب سر''

''ہم مسلمان ہیں شراب نہیں پیتے'' یہ کہہ کر گلاس ٹرے میں واپس رکھ دیا۔

''سوری سر......'' وہ بولا۔

ہم نے دیکھا صالح شیخ دوسرا گلاس پی کر تیسرے کی امید میں تھا۔ کاؤنٹر پر چابیاں تقسیم کی جا رہی تھیں۔ جب ہمارا نام پکارا گیا اسی وقت بیرا ایک گلاس لایا اور ہمیں دے دیا۔

''سر یہ شراب کے بغیر ہے......''

''شکریہ''...... ہم نے گلاس لے لیا۔

''ترکی میں اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ آئی ایم سوری......'' مراد معذرت کر رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں ہمارے ساتھ ایسا اکثر ہوا ہے......''

ہمارا اور ای ڈی کا کمرہ پہلی منزل پر تھا۔ ہم لفٹ سے اور ای ڈی زینے سے اوپر آیا۔ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ ہم نے استقبالیہ فون کیا۔ انہوں نے ہیٹنگ بڑھانے کا وعدہ کیا۔

باتھ روم میں پانی زیادہ گرم نہیں آ رہا تھا۔ ہم لباس تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گئے اور ای ڈی مراد کے ساتھ قالین خریدنے چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ہم ہوٹل کی سیر کو نکلے اور یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس وقت صرف ہمارا گروپ ہی یہاں پڑا ہوا تھا۔ انتظامیہ کا خیال تھا مراد سیاحوں کو لے کر 7 بجے آئے گا وہ چار بجے آ گیا اس لئے ہیٹنگ دیر سے شروع کی اور ہوٹل مناسب گرم نہ ہو سکا۔

استقبالیہ میں کئی لاؤنج تھے۔ ایک بار۔ بڑا ڈائننگ ہال اور ایک ریسٹورنٹ تھا۔ یہ سب خالی تھے۔ شہر سے اتنی دور اس جگہ کون آئے گا۔ مراد کو زیادہ سہولت ملتی ہوگی اس لئے وہ اس ہوٹل میں آ گیا۔

ای ڈی سات بجے واپس آیا۔ اس نے ایک قالین 5 ہزار ڈالر کا خریدا تھا جو اسے تین ماہ بعد امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں مل جائے گا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ''اس نے مہنگا تو نہیں خرید لیا۔'' ہم کیا کہہ سکتے تھے۔ نہ ڈیزائن دیکھا نہ اس کی بنائی۔ پھر اندازہ کیا ہو۔ کبھی کہتا میں نے غلطی کی پھر کہتا ٹھیک کیا۔ ہمارے خیال میں مراد نے کارپٹ کارخانے سے اس لئے خریدنے نہیں دیا ہوگا کہ اسے کمیشن نہیں ملتا ہوگا اور یہاں ٹھیک ٹھاک سودا ہوا ہوگا۔ یہ بات ای ڈی بھی سمجھ رہا تھا۔ 5 ہزار ڈالر میں تو امریکہ میں خوبصورت ترین ایرانی قالین مل سکتا ہے...... اس کے علاوہ وہ ایک ٹائیل خرید کر لایا تھا جو دیکھنے میں عام اور وزن میں اسٹیل کا معلوم ہوتا تھا۔ اس قسم کے پتھر کوئی ہمیں مفت دے تو نہ لیں۔ بے کار کا بوجھ لادنے کا فائدہ۔ لیکن جب تک دنیا میں ای ڈی جیسے لوگ موجود ہیں۔ ٹائیل بک جاتے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔ تم اس کا کیا کرو گے۔ وہ بولا۔ ''دیوار پر لگاؤں گا......'' ہم چپ رہے۔ ہمارے ملک میں ہوتا تو ہنگاموں میں پولیس پر پھینکنے کے کام آتا۔ ساڑھے سات بجے ڈنر ہوا۔ دہی، کھیرا، ٹماٹر، مسور کی گھٹی ہوئی دال کا سوپ۔ وہاں احساس ہوا کہ یہ منہ اور مسور کی دال کا محاورہ اس جگہ کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سبزیوں کا ملغوبہ اور سویٹ ڈش کے نام پر ایک سیب بھی تھا۔ اس کے بعد کمرہ اور وہ بھی ٹھنڈا۔ ہم نے دوبار استقبالیہ فون کیا وہ انگریزی نہیں سمجھتے تھے کم از کم کمرہ گرم کرنے کی مراد کو بلوایا اور بتایا ہم سردی کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے فوراً کسی دوسرے ہوٹل میں شفٹ کرو۔ 10 منٹ بعد خود استقبالیہ جا کر مطالبہ کیا ''ہمیں ہیٹر دیا جائے۔ ورنہ سردی سے اکڑ کر جان دے دیں گے اور ورلڈ بینک آپ کو ادھار دینا بند کر دے گی کہ وہ امریکہ کے زیر اثر ہے اور ہم امریکہ کے زیر سایہ ہیں۔ مراد گھبرا گیا اور مزید 10 منٹ کی مہلت مانگی۔ ہم کمرے میں آئے تو دیکھا ای ڈی پورے کپڑے پہنے کمبل اوڑھے لیٹا ہے..... سردی خاصی تھی ذرا دیر میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور دو آدمی ایک بڑا ہیٹر گھسیٹے اندر لائے اور کھٹ سے تین برنر جل اٹھے۔

پہلے ای ڈی نے کمبل اتار پھر لباس۔ پورا نہیں آدھا... اس کے بعد کمرہ وہ ہوگیا جو درکار تھا۔ ہم اطمینان سے سو گئے......

صبح ناشتے پر ہر شخص ٹھٹھرتا آیا۔ معلوم ہوا۔ سب لوگ سردی سے رات بھر پریشان رہے اور مشکل سے سوئے۔ ڈھائی بجے رات کو ڈھول پیٹنے والے آ گئے...... جو سحری کے لئے اٹھا رہے تھے۔ شہر کے ہوٹلوں میں تو یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ لوگوں کو اٹھانے ہوٹل آ گئے۔ لیکن اس جگہ آنے کا مقصد صرف اور صرف ہوٹل میں پڑنے والوں کو خواب غفلت سے اٹھانا تھا روزے کے لئے اور گورے اس بات پر پریشان تھے کہ اتنی دور دراز اس سردی کے عالم میں انہیں اٹھا دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا لوگ شہر سے ایک کوچ میں خاص طور پر جگانے آئے تھے تو خوشی ہوئی۔ ترکی والوں کو کتنا خیال ہے اور گوروں کو جب معلوم ہوا ہم ہیٹر کے سائے میں آرام فرما رہے تھے تو کچھ بھی نہ کر سکے سوائے گھورنے کے وہ بھی مراد کو... ناشتے کے فوراً بعد ایک ٹور تھا۔ زمین دوز، غاروں میں پرانے زمانے کے لوگوں کے گھر۔ ان میں پینٹنگ۔ گیارہویں صدی کے گرجا۔ اس کی ادائیگی ڈالر میں تھی۔

ہم نے مراد سے رات ہی کو پوچھ لیا تھا۔ اس ٹور میں سر جھکا کر غاروں میں دیر تک سفر اندھیرے راستوں میں جانا تھا۔ کوئی خاص چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ ہمارا پروگرام تھا۔ ہوٹل کے آس پاس کا علاقہ دیکھیں گے۔ ای ڈی نے ٹور لیا تھا ..

کوچ روانہ ہوئی۔ ہم اپنے کمرے میں آئے گیس کا ہیٹر روشن تھا۔ پھر نیچے آ کر استقبالیہ پر لنچ کے بارے میں پوچھا...... وہاں کوئی انتظام نہیں تھا۔ اتنا ضرور کہا گیا کہ آپ جو کہیں گے تیار کر دیں گے...... ہم نے ہوٹل سے باہر نکل کر دیکھا تو موسم بے حد سرد تھا۔ اس میں کہیں بھی نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے کمرے میں واپس آ گئے۔

ای ڈی نے ترکی آنے سے پہلے ایک گائیڈ بک خریدی تھی وہی پڑھتا رہتا تھا ہم نے اس کا مطالعہ کیا۔ کسی ملک کا سفر کریں اور گائیڈ پڑھ کر۔ تو کیا فائدہ سفر تو جب ہے کہ بغیر جانے بوجھے لوگوں سے ملیں مقامات آؤ وقتوں دیکھیں کتاب بند کی اور باہر کی سردی اور اندر کی گرمی سے لطف اندوز ہو کر سو گئے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی سے آنکھ کھلی۔ جب تک ریسور اٹھایا۔ فون منقطع ہو گیا تھا شاید غلط نمبر ہوگا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ ہم نے ہنگامی حالات کے لئے اپنے پاس رکھے

نمکین بسکٹ اور دو نارنگیاں لنچ کے طور پر کھا کر پانی پیا...... اور لاکھوں لیرا بچا لئے۔

شام 5 بجے ای ڈی واپس آ گیا۔ ٹور ختم ہوا۔ یہ سب سے خطرناک اور ڈراؤنا دن تھا۔ ہمارے کئی ساتھی تو اندھیرے غار میں ڈر کے مارے بیہوش ہونے لگے۔ بعض کا سانس رکنے لگا۔ ایک تو دہشت سے چلانے لگا۔

ای ڈی بھی اس ٹور سے بور تھا۔ ڈنر پر سب ہی اس کو ایک بری یاد سمجھ رہے تھے۔ آئیڈیا کو پتہ چلا ہم دن بھر ہوٹل میں تھے تو تڑپ اٹھی سیلیا بھی پریشان ہوگئی۔ وہ دونوں ہوٹل میں تھیں اور انتظامیہ نے سات بجے صبح ہیٹنگ یہ سوچ کر بند کر دی تھی کہ تمام لوگ ساڑھے سات بجے چلے جائیں گے اور شام 6 بجے واپس آئیں گے۔ ہوٹل بالکل ٹھنڈا تھا۔ ترکی میں توانائی کی کمی ہے۔ صرف ہمارا کمرہ گرم تھا ہیٹر کی وجہ سے۔ آئیڈیا نے ہمیں فون کیا تھا۔ لیکن جب اللہ بچانا چاہے تو فون منقطع ہو جاتا ہے۔

ڈنر کے بعد کوریڈور میں کئی خواتین اور حضرات صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ہم سارے دن آرام کرتے رہے تھے اس لئے تر و تازہ تھے۔ ایک صوفے پر بیٹھے تو کلے آ گئی...... ''آپ ٹور پر کیوں نہیں گئے......''

''ہمیں اندازہ تھا وہاں کیا ہوگا۔''

آپ نے کمال کی ذہانت کا ثبوت دیا۔ ورنہ سب کچھ بکواس تھا۔ میں تو جا کر پچھتائی۔ پہلے معلوم ہوتا۔ ادھر کا رخ نہ کرتی۔ لیکن یہ ہوٹل صبح سے ٹھنڈا تھا......''

''صرف ہمارا کمرہ گرم تھا۔ ہوٹل والوں نے ہیٹر دے دیا تھا......''

''بہت اچھے۔ آپ کے ساتھ خاص رعایت کی۔ کتنا اچھا ہوتا میں رک جاتی۔ آپ کے کمرے میں کافی پیتے ......'' کلے نے کہا۔

''وہ تو اب بھی ہو سکتا ہے......''

''ضرور۔'' اس نے کہا پھر سوال کیا۔

''آپ آسٹریلیا گئے ہیں......''

''نہیں۔''

''اگلی بار آسٹریلیا آئیے۔ بڑا حسین ملک ہے۔ سبزہ، بارش اور خوشگوار موسم......''

''آسٹریلیا آئے تو تمہارے مہمان بنیں گے۔'' ہم نے کہا وہ ہنسنے لگی اور ہمیں آسٹریلیا کی بارش برستی نظر آنے لگی۔

انقرہ، صدر مقام

ہماری منزل انقرہ تھی۔

انقرہ اناطولیہ کے وسط میں واقع ہے اس کا پرانا نام انگورہ ہے۔ 1923ء میں اتاترک نے ترکی کا صدر مقام استنبول سے انقرہ منتقل کیا۔ اس بارے میں بہت سی وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ یہ صاف ستھرا شہر ہے۔ اس علاقے سے ترکی پر زیادہ اچھی نظر رکھی جا سکتی ہے۔ جدید ترقی پذیر معاشی اور تجارتی شہر ہے۔ انقرہ کے لوگوں نے انقلاب ترکی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اصل بات یہ ہے اتاترک کو سانس کی بیماری تھی جگر بھی خراب تھا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا۔ "جناب سمندر کے کنارے سے منتقل ہو جائیں" لہٰذا دارالخلافہ انقرہ بنا دیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کمال اتاترک کا انتقال استنبول میں ہوا۔ ویسے ان دنوں وہ انقرہ میں آرام فرماتے ہیں۔ ہم چشم دید گواہ ہیں۔ بلکہ تصویری ثبوت بھی رکھتے ہیں۔

کوچ ہوٹل سے نکلی تو ایک دھلا دھلایا نکھرا اور خشک دن نکل رہا تھا۔ دور تک پھیلے کھیت۔ جگہ جگہ صنوبر کے درخت۔ باغوں میں نارنگیاں۔ پہاڑوں پر زیتون کے درخت پھلوں سے لدے تھے۔

ایک جگہ مراد نے بتایا یہاں نمک کے کھیت ہیں سمندر کے پانی سے نمک بنایا جاتا ہے۔

آج دوپہر کا کھانا یاران ریسٹورنٹ میں تھا۔ مراد کھانوں کے نام اور قیمت بتا کر آرڈر لینے لگا۔ لوگ اِدھر اُدھر میزوں کے گرد بیٹھ گئے۔ ای ڈی صحت بنانے باہر تیز تیز چکر لگانے لگا۔ وہاں مچھلی نہیں تھی اس لئے ہم نے پین کیک کا آرڈر دیا۔ یہ ایک طرح کا موٹا پراٹھا تھا۔ ٹماٹو کیچ اپ لگا کر کھایا۔ پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ باہر کرسیوں پر آ بیٹھے۔ آئیڈیا صبح کے ناشتے سے اٹھائی چیزیں کھا رہی تھی۔ سیلیا ہمیں دیکھ کر خوش ہوگئی اس نے چائے کو پوچھا۔ ہم نے شکریہ ادا کیا۔ مراد بھی اپنی پسند کا کھانا کھا کر آ گیا۔ ہم نے پوچھا اس ہوٹل کے باہر کئی ملکوں کے پرچم لہراتے ہیں یہاں تک کہ جاپان تک کا ہے۔ پاکستان کا کیوں نہیں ہے؟" مراد نے بتایا۔ "جس ملک کے سیاح زیادہ آتے ہیں۔ اس ملک کا جھنڈا ہر جگہ لگ جاتا ہے۔ ہم نے کہا۔ لیکن پاکستان تو ترکی کا دوست ملک ہے۔ مراد نے کہا۔ اس بات کو جانے دیں۔ آپ دوبارہ ترکی آئیں گے اور جہاں جہاں جائیں گے ہم وہاں پاکستان کے جھنڈے لگا دیں گے۔"

آئندہ ترکی اسی مقصد کے لئے جانا ہوگا۔ کوچ روانہ ہوئی تو مراد ترکی کا نظام حکومت بتانے لگا۔ یہ جمہوری ملک ہے۔ پانچ سال میں انتخابات ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ وزیراعظم اور صدر ہوتا ہے۔ مزے کی بات ہے ووٹ ڈالنا ضروری ہے۔ ورنہ جرمانہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ قانون ہوتا تو جس سال انتخاب ہوتا۔ حکومت کے اخراجات جرمانوں سے نکل آتے۔ پہلی بار ووٹ نہ دیں تو 50 امریکی ڈالر اگلی بار جرمانہ ڈبل اسی طرح بڑھتا جاتا ہے۔ لوگ ذوق و شوق سے ووٹ دیتے ہیں جرمانے سے بچنے کے لئے صدر کا انتخاب 7 سال کے لئے ہوتا ہے اور کوئی شخص دوبارہ صدر نہیں بن سکتا۔ وزیراعظم جب تک جی چاہے اور قوم باری دے وہ وزیراعظم بن سکتا ہے۔ صدر روایتی طور پر قانون پر دستخط کرتا ہے۔

ایک لطف کی بات یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کو حکومت انتخاب لڑنے کے لئے رقم مہیا کرتی ہے اور اس کا تخمینہ جماعت کی پرانی کارکردگی پر ہوتا ہے۔ ترکی کی معاشی بدحالی کی ایک

وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ یہ غیر پیداواری سرمایہ کاری ہے۔

ترکی میں وہی ہوتا ہے جو دوسرے جمہوری ملکوں میں ہوتا ہے۔ اتاترک بے حد مقبول ہیں۔ انہیں دنیا سے گزرے عرصہ ہو گیا لیکن ان کا جامعہ ابھی تک لوگوں پر حاوی ہے۔

انور کمال پاشا کو ''اتاترک'' نام ترکی کی پارلیمینٹ نے دیا۔ اتاترک کا مطلب ہے ترکوں کا باپ اور اس شریف آدمی نے بھی اس نام کی لاج رکھی۔ ایک شادی کی ڈیڑھ سال چلی۔ بعد کو گڑ بڑ ہوگئی لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اتاترک نے جان بوجھ کر اولاد سے پرہیز کیا فیملی پلاننگ کے لئے نہیں بلکہ ان کا خیال تھا بعد کو اولاد اقتدار میں حصہ نہ مانگے ویسے بھی وہ سارے ترکوں کا باپ تھا۔ پھر اولاد کی کیا ضرورت۔ جہاں تک اولاد کا اقتدار میں حصہ لینے کا تعلق ہے وہ ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ ہندوستان سے سری لنکا اور پاکستان سے بنگلہ دیش تک عوام اولادوں کی اولادوں کو اقتدار دیتے دیتے تھک گئی ہے۔ اس بات پر ہم اتاترک کے ممنون ہیں۔ ترک ہوں نہ ہوں۔

اتاترک نے ملٹری اسکول میں پڑھا۔ استادوں نے نام کمال دیا اور انہوں نے واقعی ترکی میں کمال کر دیا۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ ترقی کرتے گئے وہ پہلی جنگ عظیم میں بہادری سے لڑے۔ بلغاریہ صوفیہ میں ملٹری اتاشی رہے۔ . . . اور جب برطانیہ نے استنبول پر قبضہ کیا۔ اتاترک نے ملٹری سے استعفیٰ دیا۔ وہ عثمانی بادشاہ اور برطانیہ کے معاہدے کے خلاف تھے۔ انہوں نے اپنی فوج بنائی۔ ایک پارلیمینٹ تشکیل دی اور آخری عثمانی بادشاہ کو معزول کر دیا۔ بادشاہ اور اس کا خاندان ملک بدر ہوا۔ وہ برطانیہ وہاں سے یونان گئے اور پھر اٹلی میں انتقال کر گئے اولادیں برباد ہوئیں۔ کچھ لوٹ آئے اور اتاترک کے حامی ہو گئے۔ سنا ہے۔ ایک شہزادہ نیویارک میں ہے۔ لیکن اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ہم نیویارک میں جب کسی معزز بزرگ کو دیکھتے ہیں شہزادہ سمجھتے ہیں کمال اتاترک جمہوریہ ترکی کے پہلے صدر تھے تو ایک عظیم انقلاب برپا کیا ترکی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اتاترک نے لاطینی میں کر دیا زبان سے فرنچ عربی اور فارسی لفظ خارج کر دیئے۔ عورتوں کو برابر کے حقوق دیئے اور ملک کو لامذہب قرار دیا۔ 15 سال وہ صدر رہے اور اس عرصے میں سب کچھ بدل دیا۔ زبان، لباس، رہن سہن اور نوجوانوں کی سوچ۔ وہ نہ جانے اور کیا کرتے کہ موت نے مہلت نہ دی۔ 57

سال کی عمر میں 10 نومبر 1938 کو انتقال کر گئے اس دن ترکی کی گھڑیاں صبح نو بجکر 5 منٹ پر احتراماً روک دی جاتی ہیں۔ اور پھر سب کچھ وہی ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ملک کو سیکولر بنایا۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اسلام اپنی پوری آب و تاب سے ترکی کے چپے چپے میں روشن ہے..... اس کی روشنی ہر طرف پھیلتی ہے۔

انہیں اُن کے زمانے میں جہاں لوگ پسند کرتے تھے وہیں مخالفین کی تعداد بھی بڑی تھی۔ وہ آج بھی ہے اور جاری رہے گی اور یقین ہے ایک دن لامذہب حکومت اسلام قبول کر لے گی۔

مراد نے بتایا۔ قبرستانوں میں مرنے والوں کی قبروں پر پیدائش کا سن ہجری اور مرنے کا عیسوی تحریر ہوتا ہے۔ شہروں میں آزادی ہے۔ استنبول میں لڑکی۔ لڑکا شادی کے بغیر ایک ساتھ رہ سکتے ہیں ایک سے زیادہ شادی کر لیتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے اسقاط حمل کی سہولت ہے۔ لیکن دوسرے علاقوں میں ایسا نہیں ہے۔ وہی ہے جو اسلام حکم دیتا ہے۔ بڑوں کی عزت، چھوٹوں سے حسن سلوک۔ استنبول کے باہر اور خاص طور سے چھوٹے علاقوں میں رمضان کے مہینے میں سڑک پر کھانے سے پرہیز کی ہدایت کی جاتی تھی۔

انقرہ یونانیوں اور رومن سے ہوتا ہوا 1402 میں دولت عثمانیہ میں شامل ہوا۔ اتاترک کی جمہوریت کے لئے جنگ میں یہ مرکز تھا۔ اس شہر میں دیکھنے اور سیر کے بہت سے مقامات ہیں۔ میوزیم پارک، مساجد اور یادگاریں۔ ایک بڑی مارکیٹ تانبے کے سامان کی ہے۔ لیکن یہاں کاسمیٹکس، جیولری اور قالین بھی ملتے ہیں۔ ہمیں ان میں سے کسی چیز سے رغبت نہیں۔ باقی مقامات کے بارے میں مراد نے زبانی بتا دیا ایک مکان کے بارے میں خاص طور پر بتایا یہ ترکی کے قومی شاعر محمد عاکف کا ہے جس نے لاتعداد انقلابی نظمیں لکھیں اور ترکی کا قومی ترانہ بھی اس کی تخلیق ہے یوں سمجھیں پاکستان کے حفیظ جالندھری ہیں۔

****

اتاترک کے مزار پر

انقرہ بہت بڑا شہر ہے۔ میلوں دور سے استقبال کرنے لگا۔۔۔ گھر۔ اپارٹمنٹ اور کارخانے آنے لگے۔ سڑکیں پھیل گئیں۔ ٹریفک بڑھ گیا۔ شہر کے بیچوں بیچ پہنچے تو بلند و بالا عمارتوں نے ہمیں کھڑکیوں سے دیکھا۔ مراد ہمیں ایک بڑے اعزاز سے نواز نے جا رہا تھا۔ ہم ترکوں کے باپ سے ملنے جا رہے ہیں۔ اتاترک روڈ پر سب اہم عمارتیں تھیں۔ وزارتوں کے دفتر فوجیوں کے ہیڈکوارٹر، پارلیمنٹ ہاؤس اور پھر ایک سیدھی سڑک اتاترک کے مقبرے تک لے گئی۔ پارکنگ ایریا میں کوچ رک گئی۔ سامنے بہت سی سیڑھیاں تھیں۔ پھر ایک لمبا راستہ تھا۔ اس کے بعد مقبرہ آتا ہے یہ سب ایک بہت بڑی جگہ پر بنایا گیا ہے۔۔۔۔ کوچ سے اتر کر ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دائیں بائیں مجسمے تھے۔ پھر ایک طویل راستہ۔ دائیں طرف تین عورتوں کے مجسمے، ترکوں کے تین طبقوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور یہ سب رو رہی تھیں۔ ظاہر ہے جس کا

باپ مرے گا وہ تو روئے گا۔ سیاح دیکھ کر متاثر ہونے لگے۔۔۔۔۔ ان عورتوں کی شکلیں بری تھیں۔ یا ہو سکتا ہے، ترک عورتیں روتی بری لگتی ہوں۔ انہیں دیکھ کر ہمیں بھی رونا آیا کہ اتاترک کو مرے 63 سال ہو گئے اور یہ عورتیں ابھی تک رو رہی ہیں۔۔۔۔۔

بائیں طرف بھی تین مجسمے کھڑے تھے۔ آگے ایک فوجی کھڑا تھا اس کے برابر طالب علم اور پیچھے کسان تھا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کسان فوجی اور طالب علم کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ ہمارے ملک میں وہی بااثر آدمی کہلاتا تھا جس کی پشت مضبوط ہو۔۔۔۔۔ یہاں فوجی اور طالب علم دونوں کی پشت کسان مضبوط کر رہا ہے ایک دل جلا سیاح کہنے لگا۔ فوجی اور طالب علم کسان کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ فوجی کو کسان کے پیچھے ہونا چاہئے تھا ایک طرف تو دنیا کہتی فوجی گن کمر سے لگا کر زبردستی کام کروا رہا ہے۔ ایک کا کہنا تھا تینوں کو ایک لائن میں کھڑے ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے سمجھایا جس چبوترے پر یہ کھڑے ہیں اس پر جگہ کم ہے اس لئے آگے پیچھے کھڑے ہیں۔ ای ڈی نے خواتین کے مجسمے دیکھ کر کہا یہ کسان کی گھر والیاں ہیں اور اس بات پر رو رہی ہیں کہ ان کے خاندان کے سربراہ کو فوجی پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو کیا سمجھاتے۔ بس لمبے راستے پر چل پڑے۔ جس کے دونوں طرف بارہ بارہ شیر منہ کھولے کھڑے ہیں اس جگہ شیر کے مجسموں کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ مراد نے سمجھائی بھی نہیں۔ یہ راستہ لمبا تھا اس کے بعد سیڑھیاں۔ میدان پر سیڑھیاں ہم نے مراد سے پوچھا۔ اگر ہندوستان کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اس جگہ آئیں تو کیا ہوگا۔ ان کے تو گھٹنے ابھی تبدیل ہوئے ہیں۔"

وہ کہنے لگا۔" انہیں بھی چل کر آنا پڑے گا۔۔۔۔۔"

ہم سمجھ گئے۔ اسی لئے اٹل بہاری واجپائی ترکی کا دورہ نہیں کرتے بلکہ سارے کمزور سربراہان مملکت پرہیز کرتے ہیں۔ ہم میدان میں پہنچے تو بائیں طرف اتاترک کا مقبرہ چاروں طرف میوزیم، کمرے اور بک شاپ تھی۔

مراد نے بتایا۔" تھوڑی دیر میں مقبرے کی گارڈ تبدیل ہوگی"۔۔۔۔۔

اور اسی وقت ایک طرف سے گارڈ دوسری طرف جانے لگے۔ تمام لوگ دیکھنے کھڑے ہو گئے۔

بائیں طرف سیڑھیاں ہی سیڑھیاں تھیں گارڈ اوپر چڑھنے لگے اور ہم بھی۔ سیڑھیاں چمکدار سرخ پتھر کی بنی ہیں اور اتاترک کے مقبرے کی شان وشوکت بڑھاتی ہیں۔

دراز قد کے اسمارٹ۔ خوبصورت لباس پہنے گارڈ تبدیل ہو رہے تھے جو جا رہے تھے۔ ان سے بندوق لے کر دوسرے اُسی جگہ کھڑے ہو رہے تھے۔ ہر طرف سے تصویریں لی جا رہی تھیں ان میں ہم بھی شامل تھے۔

مقبرہ بہت بڑی جگہ میں تھا...... اندر قبر تھی۔ اتاترک آرام کر رہے تھے انکی تقریریں لکھی تھیں۔ انگریزی میں ترجمہ بھی تھا۔ انہوں نے فوج کو خطاب کیا تھا۔ ''ملک کی حفاظت کرنا اور سیکولر ازم کی بھی جو ملک کی اصل ترقی ہے۔'' حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہاں کوئی قرآنی آیت نہیں لکھی تھی۔ ہم نے ان کے لئے دعائے مغفرت کی اور نیچے اتر آئے۔

میدان کے دائیں طرف میوزیم تھا۔ جس کا ٹکٹ نہیں تھا، حیرت ہوئی سردی سے بچنے اور میوزیم کی سہولت سے فائدہ اٹھانے ہم اندر داخل ہوئے۔ یہاں اتاترک کے استعمال میں رہنے والی اشیاء تھیں ایک طرف لباس، زیادہ تر گرم کپڑے کوٹ، گاؤن، فوجی وردی، ایکسر سائز کا سامان، مختلف جوتے، جن سے ان کے پاؤں کے نمبر کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ چھڑیاں، کئی قسم کے دستانے، سگریٹ کیس، اتاترک سگریٹ پیتے تھے۔ جگر کی خرابی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ اس قسم کی بیماریاں لیڈران کرام کو قوم کا غم اور اسے غلط کرنے کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔ بہت سی تلواریں، ایک شہنشاہ ایران کی طرف سے تحفے میں ملی تھی وہ سارے میڈل جو فوج میں اعلیٰ خدمات پر ملے اس گھر کی تصویریں جہاں پیدا ہوئے تھے۔

ایک تصویر ہم نے بہت تلاش کی لیکن افسوس مل نہ سکی وہ ان کی بیگم کی تھی۔ وہ بھی رکھنی چاہئے۔ تصویریں بہت سی تھیں۔ لیکن خاندان کے افسران کی بھی غائب تھیں۔

ان کے استعمال میں رہنے والے چینی کے برتن۔ چائے اور کافی کے سیٹ۔ ان چیزوں سے اتاترک کی نفاست اور اعلیٰ ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔

جو مقبرہ دیکھنے آتا ہے۔ یہاں بھی آتا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے لڑکیاں اکثر گروپ کی شکل میں آتے اور اتاترک کی تعلیمات کو تازہ کرتے ہیں۔ انتظامیہ اس جادو کو اترنے نہیں دیتی۔

بائیں طرف ایک بک شاپ تھی۔ یہاں اتاترک کے بارے میں کتابیں اور رسالے فروخت ہوتے ہیں۔ ان کی قیمت زیادہ ہے... سیاحوں کو یہ مفت ملنی چاہئیں تاکہ وہ ترکوں کے عظیم باپ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکیں۔

اس دوپہر مراد نے ترکی کے ننھے ننھے جھنڈے لئے مفت تقسیم ہوئے جو کوٹ کے کالر میں لگائے جاسکتے تھے۔

انقرہ میں مقبرہ تعمیر ہونے میں ایک طویل عرصہ لگا۔ جب تک اتاترک استنبول میں سوتے رہے۔ آخر اس عظیم انسان کو انقرہ کے طویل مقبرے میں جو 1953ء میں مکمل ہوا لٹا دیا گیا۔ یہ ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

....

انقرہ میں چہل قدمی

ہمارا قیام و طعام سیگ مین ہوٹل میں تھا۔ جو شہر کے بیچوں بیچ تھا۔ نزدیک ہی اتاترک بلیوارڈ اتاترک اسکوائر جہاں اتاترک کا مقبرہ تھا۔ اور محمد علی جناح روڈ جس میں پاکستان کا سفارت خانہ تھا۔ ہمیں محمد علی جناح بانی پاکستان کے نام پر سڑک دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ایک زمانے میں پاکستانی سفارت خانے میں افسانہ نگار کرامت غوری ہوا کرتے تھے۔ جب انہیں اطلاع ملی ہم انقرہ جانے والے ہیں وہ ریٹائرمنٹ لے کر کینیڈا چلے گئے ہمیں یہ احساس ہوتا تو کبھی ترکی کا رخ نہ کرتے۔

سیگ مین ہوٹل اچھا تھا ...... بڑا لاؤنج اس میں صوفے، چند سیڑھیاں اتر کر ایک اور لاؤنج، کاؤنٹر پر انگریزی بولنے والی خاتون ہوٹل سے ذرا آگے ایک چوراہے پر بڑی عالی شان مسجد بنی تھی۔ یہ کئی سو سال پرانی اور ابھی تک اچھی حالت میں ہے۔ پانچوں وقت اذان اور نماز

ہوتی ہے۔ کمرے میں سامان رکھ کر انقرہ کی سیر کا پروگرام تھا۔ اس شہر میں کرائے پر کام لینے کی سہولت تھی۔ پھر ہوٹل کے کاؤنٹر پر فورڈ گاڑیوں کے بروشر رکھے تھے جس میں کرائے پر لینے کی شرائط درج تھیں۔ جو یہ گاڑی لے گا کم از کم 21 سال کا ہو۔ اس کے پاس ایک سال پرانا ڈرائیونگ لائسنس ہو دوران سفر شراب نہیں پیے گا۔ خواتین کا ایک بڑا طبقہ اس شرط کے بعد گاڑی کرائے پر نہیں لے سکا۔ عمر کی قید لگانے کا تعلق ہی رکھا۔ صاف کہہ دیتے خواتین کو گاڑی نہیں دیں۔ رفتار تیز نہیں کرے گا۔ جس نے گاڑی لی ہے وہی چلائے گا۔ دوسرا ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں بیٹھے گا۔ 300 امریکی ڈالر زر ضمانت جمع کرانے پڑتے ہیں۔

ای ڈی نے جو شرائط پڑھیں تو پیدل چلنے پر آمادہ ہوگیا۔ مراد نے بتایا دو چار گلیاں چھوڑ کر اتاترک بلیوارڈ آ جائے گا۔ اس پر بڑے اسٹور ہیں۔ کھانے پینے پہننے اور اوڑھنے کی سب ہی چیزیں ملتی ہیں ہمیں ''بکلاوا'' درکار تھا امید تھی وہ کسی دکان پر مل جائے گا۔

ہم اور ای ڈی تنہا سیر کو جانے کے لئے کوریڈور میں آئے تو نے اور کلے بھی مل گئیں۔ آئیڈیا بھی چلنے پر آمادہ ہوگئیں۔ اب یہ قافلہ سفر پر نکلا تو دو گلیوں کے بعد راستہ بھول گیا۔ وجہ یہ تھی کہ سڑک کا بڑا حصہ زیر تعمیر تھا۔ اِدھر اُدھر بھٹک گئے۔ سڑکیں کہیں اونچی نیچی تھیں اس حد تک کہ احساس ہو رہا تھا۔ انقرہ کا یہ حصہ ٹرائے شہر پر بنا گیا ہے۔ اس پر ٹریفک، ہر طرف سے گاڑیاں آ رہی تھیں اور وہ پیدل چلنے والوں کے لئے روکنے کے عادی نہیں تھے۔ جان پیاری ہے تو خود بچو۔ اسی لئے ہم دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کو جگہ دے رہے تھے۔

انقرہ وہ شہر ہے جہاں کسی دکان یا راہ گیر سے راستہ نہیں پوچھا جاسکتا۔ کیونکہ وہ انگریزی نہیں سمجھتے اور ہم ترکی سے ناواقف ہیں۔ اس کا فائدہ ہے۔ ہم پوچھتے اور وہ غلط بتاتے یا سمجھاتے۔ ہم ترکوں کو برا کہتے فیصلہ یہ کیا خود بھٹکو ... خود راستہ تلاش کرو۔ گلی میں بینک نظر آیا۔ ہم نے ڈالر کیش کرانے کے لئے اندر کا رخ کیا۔ سب ہمارے ساتھ آئے۔ بینک آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ راستہ پوچھیں۔

اس میں کامیابی ہوئی۔ باہر نکلے تو ہمارے ساتھ ٹوٹی پھوٹی آئیڈیا اور ای ڈی تھا۔ نے اور کلے کسی سے لیے نکل لی تھیں۔

ٹوٹی ہوئی سڑک۔ بجری کا ڈھیر۔ سیمنٹ کی بوریاں اور عارضی پل پر سے گزر کر ایک چوڑی سڑک پر آ گئے۔ یہی اتاترک بلیوارڈ تھی۔ مشکل وقت میں اتاترک نے ساتھ دیا۔ دائیں طرف دکانیں تھیں۔ ہم آگے بڑھتے رہے بائیں ہاتھ پر دو چوڑی سڑکیں اور کمال اتاترک کا عظیم الشان مقبرہ ایک سمت بازار نظر آیا۔ ہم اس میں گھس گئے۔ یہاں دونوں طرف دکانیں تھیں کتابوں کی۔ کھانے پینے کی اشیاء اور چھوٹے چھوٹے ہوٹل۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے مطلب کی نہیں تھی۔ ایک چکر لگانے کے بعد فٹ پاتھ پر سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ایک طرف پھر بڑی سڑک مڑ رہی تھی اور ادھر دوکانیں نظر آ رہی تھیں۔ ای ڈی کا رخ اس طرف ہوا۔ ہم نے اسے روک دیا زندگی بھر اپنے رب سے سیدھے راستے پر چلانے کی دعا کرتے رہے ہیں۔ اس لئے سیدھے جائیں تو بھٹکنے سے بچ جائیں گے۔ ای ڈی اور آئیڈیا نے ہماری بات مان لی اور چل پڑے ۔ فٹ پاتھ کی حالت یہ تھی کہ اچانک نیچی ہو جاتی۔ اس پر سیڑھیاں آ جاتیں۔ پھر اونچی ہوتی۔ بعض جگہ لوہے کی رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ایک بار تو آئیڈیا گرتے گرتے بچی۔ کیونکہ اچانک فٹ پاتھ ختم اور سیڑھیاں شروع۔ ای ڈی کو بھی ٹھوکر لگی۔ اس لئے نیچے دیکھ کر چلنا شروع کیا۔ رک رک کر آس پاس کے منظر بھی دیکھتے جاتے ایک میگ ڈانلڈ کی دکان نظر آئی تو آئیڈیا نے فرنچ فرائز خرید لی چاہی۔ ہمارے لئے یہ خوشی کی بات تھی۔ اس جگہ سستا لیں گے۔ وہاں الی شاہ اور اس کی ماں مل گئیں۔ الی شاہ ای ڈی کو دیکھ کر خوش ہوئی اور چمٹنے لگی۔ اس کی ماں ہم سے "ہائے ہیلو" کرنے لگی۔ اور کیا کرتی ۔ یہ دونوں شاپنگ کے لئے جا رہی تھیں۔

آئیڈیا نے ایک کولڈ ڈرنک لیا۔ فرنچ فرائز نوش کی اور تر و تازہ ہو کر دکانوں پر حملے کے لئے چل پڑیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ بڑے اسٹور تھے۔ یہاں الیکٹرانک کا سامان، گھڑیاں، جیولری، پھر ایک سینما گھر۔ آگے جا کر شاپنگ مال۔ اس میں داخل ہوئے تو باہر کی سردی سے بچے پہلی منزل پر گھر میں استعمال ہونے والی اور کھانے پینے کی اشیا تھیں۔

ہر ایک کی قیمت لاکھوں لیرا میں ۔ جہاں غیر ملکی شیمپو رکھا تھا وہ انتہائی مہنگا۔ دوسری منزل پر سبزیاں، فروٹ، الی شاہ اور اس کی ماں یہاں ادھر اُدھر سامان پر گرتی نظر آئیں۔ سوکھے ہوئے انجیر امریکہ میں ایک ڈالر میں پیکٹ ملتا ہے۔ یہاں 70 سینٹ کا تھا۔ آئیڈیا نے سستے کا نعرہ لگا کر کئی خرید لئے۔ اپنے بوجھ کے ساتھ وہ یہ امریکہ کی ریاست میامی لے جائیں گی۔

مٹھائی کے حصے میں ٹرکش ڈیلائٹ ڈھیروں تھیں۔ چکھ کر دیکھیں بے حد میٹھی اور ذائقے میں زیادہ بہتر نہیں تھیں۔ مجبوراً ایک مٹھی سوکھے چنے خریدے اور پستے سمجھ کر کھاتے رہے۔

آئیڈیا نے جو ترکش ڈیلائٹ کے ڈھیر دیکھے تو خوشی میں کئی کلوگرام خرید لیں۔ ای ڈی کو بھی پسند آئیں لیکن ہم نے خریدنے سے معذرت کر لی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہاں بکلاوا نہیں تھا۔ ترکی آئے دن ہو گئے۔ لیکن اس عظیم الشان ترکش مٹھائی کے دیدار سے محروم تھے۔

اسٹور سے باہر نکلے تو ہوٹل واپس آنے کا پروگرام بنایا۔ آئیڈیا نے ای ڈی کو اپنی خریدی ہوئی ترکش ڈیلائٹ اور کئی تھیلے پکڑا دیئے۔ انہیں لیتے جاؤ....."

"اوہ یقیناً"۔ ای ڈی نے خوشی خوشی لے لئے اور وہ مسکرانے لگیں انہیں دوسری شاپنگ کرنی تھی۔

انقرہ میں رات اور سردی پھیل چکی تھی اور ای ڈی بار بار تیر کی طرح نکل جاتا۔ پھر رک کر ہمارا انتظار کرتا جب تک اتاترک بلیوارڈ..... اور اتاترک روڈ رہا۔ خیریت رہی۔ اس کے بعد ای ڈی غائب ہو گیا۔ ایک روڈ پر مڑے تو راستہ بالکل گم ہو گیا۔ اندھیرا۔ راستہ اونچا نیچا۔ سردی اور اجنبی لوگ۔ ناواقف زبان۔ اطمینان یہ تھا کہ ہماری جیب میں ہوٹل کا کارڈ ہے...... جب مکمل مایوس ہوں گے۔ کسی ٹیکسی والے کو دکھا کر منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

جو سڑک تعمیر ہو رہی تھی۔ وہ غائب تھی۔ بغداد ہوتا تو سمجھتے الہ دین کے جادوئی چراغ کے جن نے بنا دی۔ انقرہ میں دو گھنٹے میں یہ کارنامہ ممکن نہ تھا۔ اس لئے پہلے تو زیر تعمیر سڑک کی تلاش شروع کی وہ انقرہ والوں نے چھپا لی۔ فٹ پاتھ پر اندھیرے میں ایک مجسمہ نظر آیا دیکھا تو وہ ای ڈی تھا۔ نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ ہم تو اس پر فاتحہ پڑھ چکے تھے وہ بھی راستہ بھول گیا تھا۔ ایک سے بھلے دو۔ اب تلاش شروع ہوئی عارضی پل نظر آ گیا جس سے گزر کر گئے تھے۔ خدا کا شکر ادا کر کے اس پر قدم رکھا آگے پتھر پڑے تھے۔ سامنے سڑک تھی۔ وہ بھی اونچی نیچی۔ اور جگہ جگہ پتھر۔ جیسے ہمارے ملک میں پولیس اور عوام میں مقابلے کے فوراً بعد کا منظر ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہو گیا مصطفیٰ زیدی انقرہ آئے ہوں گے اور یہ سڑک جب سے زیر تعمیر ہے۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا۔

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اس رات کس طرح ہوٹل پہنچے۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ بس یوں سمجھ لیں جس طرح کولمبس امریکہ آیا تھا اسی طرح ہم سیگ مین ہوٹل تک پہنچے نام کا بورڈ دیکھا تو اطمینان ہوا۔ فون بوتھ کا پتہ معلوم کرنا ہے۔ جہاں سے کارڈ فون ہوسکتا ہو.... کاؤنٹر سے پوچھا تو خاتون نے کہا۔ ''لفٹ کے سامنے فون کارڈ لگا ہے''...... ہم بے یقینی کی کیفیت سے وہاں پہنچے تو کارڈ فون کے دو بوتھ لگے تھے۔ اس وقت جو دل سے سیگ مین ہوٹل والوں کے لئے دعا نکلی وہ اگر سن پاتے تو ہوٹل میں قیام و طعام مفت کر دیتے۔ ہم نے اپنے جذبات کا اظہار اس لئے نہیں کیا کہ طعام و قیام پہلے ہی مفت تھا۔

سونے کا بادشاہ

ایک تھا بادشاہ۔ اسے سونا بے حد پسند تھا۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ بادشاہ کو سونا پسند نہیں ہوگا تو کسے ہوگا۔ دراصل بادشاہ ہر وقت سونے کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن کہانی بنی جب ایک دن بادشاہ محل سے باہر آیا اور دیکھا ایک غریب آدمی سردی سے ٹھٹھر رہا ہے۔ اکثر بادشاہ اس قسم کے مناظر دیکھتے نہیں۔ یا پھر ان کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور خاص طور پر وہ بادشاہ جو ہر وقت سونے کی تلاش میں رہتا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بادشاہ نے اس سردی سے سکڑتے غریب آدمی کو محل میں بلوایا۔ کھانا اور کپڑے دیئے۔ وہ شخص ایک دیوتا تھا۔ اس خدمت کے صلے میں اس نے بادشاہ سے اس کی کوئی خواہش پوچھی بادشاہ کو جب معلوم ہوا کہ وہ جس آدمی کو غریب اور ضرورت مند سمجھ کر لے آیا تھا وہ تو دیوتا ہے تو فوراً بہت سے سونے کی فرمائش کر بیٹھا۔ پھر بولا۔ ''مجھے ایسی طاقت دو کہ جس چیز کو

ہاتھ لگاؤں سونا بن جائے۔"

دیوتا نے کچھ سوچا پھر بولا۔ "کل سورج کی پہلی کرن نکلے گی تو تم میں ایسی طاقت پیدا ہوجائے گی جس چیز کو ہاتھ لگاؤ وہ سونا بن جائے۔" دیوتا غائب ہوگیا۔ اور بادشاہ سورج نکلنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا اسے احساس ہوا رات دیر تک رہتی ہے صبح جب سورج کی پہلی کرن نکلی بادشاہ اپنے محل کی کھڑکی میں کھڑا تھا اس نے فوراً ایک چھڑی کو ہاتھ لگایا وہ سونے کی ہوگئی۔ بادشاہ خوشی سے پاگل ہوگیا اور ہر چیز کو چھو کر سونا بنانے لگا۔ محل کی تمام چیزیں سونے میں تبدیل ہونے لگیں لیکن بادشاہ کا دل نہ بھرا۔ ناشتے کی میز پر اس نے انڈا اٹھایا وہ سونے کا بن گیا۔ جوس لیا وہ سونا بن گیا۔ روٹی سونے میں تبدیل ہوگئی۔ یہ بات پریشانی کی تھی لیکن بادشاہ اس پر بھی خوش ہوا۔ اچانک اس کی چھوٹی بیٹی بھاگتی ہوئی آئی۔ بادشاہ اس بیٹی سے سب سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ اس نے لپک کر گود میں لیا اور بچی سونے میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے بازو میں ایک مسکراتا ہوا سونے کا مجسمہ تھا۔ بادشاہ حیران ہوا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ملازم بھی پیچھے ہٹ گئے۔ کوئی سونے کا مجسمہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اب بادشاہ کو ہوش آیا کہ وہ ایک ایسی خواہش کرچکا ہے جس میں زندگی بھر نہ کھاپی سکتا ہے نہ کوئی اس کے نزدیک آسکتا ہے اور اس کی سب سے پیاری بیٹی جسے وہ اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا سونے کا مجسمہ بن چکی تھی۔ یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ وہ مدد کے لئے چیخنے لگا لیکن کوئی نزدیک نہیں آیا وہ رونے لگا۔ سر پیٹنے لگا۔ دیوتاؤں کی دہائی دینے لگا۔ دوپہر اور پھر شام ہوگی۔ بادشاہ غم سے پاگل ہوگیا۔ اسے سونے سے نفرت ہوگئی وہ مسلسل رو رہا تھا۔ دیوتاؤں کو بلا رہا تھا۔ تب وہی دیوتا نمودار ہوا۔ بادشاہ اس کے قدموں میں گر گیا۔ "مجھ سے یہ طاقت واپس لے لو۔ مجھے سونا نہیں پیاری بیٹی چاہئے مجھ پر رحم کرو۔ سارا سونا دولت واپس لے لو"...... وہ رو رہا تھا۔ دیوتا کو ترس آگیا اس نے کہا "کل جب سورج کی پہلی کرن نکلے گی۔ تمہاری طاقت ختم ہوجائے گی۔ پھر جس چیز کو ہاتھ لگاؤ گے وہ اصل صورت میں واپس آجائے گی۔"

بادشاہ کے لئے ایک اور کٹھن رات گزری اور صبح ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا جو آنکھ کھول کر مسکرانے لگی۔

یہ کہانی بادشاہ میڈاس کی ہے۔ جو سونے کے لالچ میں دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہم اس

کے مقبرے کی طرف جا رہے تھے۔

پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ روایت ہے کہ یہاں سکندر اعظم آیا تھا ضرور آیا ہوگا۔ ترکی میں دنیا کا ہر بڑا آدمی آیا ہے۔ ان میں ایک ہم ہیں۔ کچھ عرصے بعد گائیڈ ہمارے بارے میں بھی اسی طرح بیان کیا کریں گے۔ یہ پہاڑی علاقے میں مختلف قبرستان ہیں۔ ایک پہاڑ سے بادشاہ میڈاس کی قبر دریافت ہوئی۔

اس علاقے میں شدید سردی تھی۔ اتنی زیادہ کہ کوچ کی کھڑکیوں کے کنارے پر برف جمنے لگی۔ نقطہ انجماد گرا ہوا تھا۔ ایک بڑے پہاڑ کے سامنے کوچ روک دی گئی۔ یہاں بادشاہ میڈاس کی قبر پر جانا ہے۔ ہمیں اُمید تھی خود تو ظالم سونے کے لالچ میں ہاتھ لگا کر اپنی بیٹی تک کو سونے کا مجسمہ بنا گیا تھا اور ہمیں سردی سے ٹھٹھر کر برف کا مجسمہ بنانا پڑے گا۔ ہم نے طے کرلیا کہ اس پہاڑ پر کسی قیمت پر نہیں چڑھیں گے۔ لیکن جب آئیڈیا تک اتر گئی تو ہماری مردانگی کو ایک چیلنج کا سامنا کرنا پڑا اور صرف کوچ سے اترنے کے لئے ہم بھی نیچے آگئے۔ باہر سردی کی شدت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ پہاڑ کے نیچے ایک سیمنٹ کا راستہ بنا تھا۔ جو ایک لوہے کے گیٹ پر ختم ہوتا تھا۔ اس پر چل سکتے ہیں سب ہی جا رہے تھے جب لوہے کے دروازے کے پاس پہنچے تو وہاں بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ مراد بھاگ کر سڑک پار میوزیم میں گیا۔ جہاں اس کی چابی ہوتی ہے منتظمین نے سوچا ہوگا اس برف جماتی صبح کون آئے گا۔ لیکن سیاح تو موت کے فرشتے کی طرح ہر جگہ جاسکتا ہے۔ لوہے کا دروازہ کھلا تو ہم سردی سے بچنے کے لئے اندر کمرے میں آگئے۔ وہاں مختلف تصویریں لگی تھیں۔ جن سے اس پہاڑ کے نیچے کھودی ہوئی قبر۔ اس میں سے برآمد شدہ اشیاء اور وہ ڈھانچہ نظر آ رہا تھا جس کے بارے میں مراد کا خیال تھا یہ دنیا کا سب سے پرانا سات سو سال قبل مسیح کا ڈھانچہ ہے وہ اگر ساٹھ ہزار کہتا تب بھی ہم مان لیتے۔ کیونکہ ہم سیاح تھے اور وہ گائیڈ۔

کمرے کے بعد سرنگ تھی۔ جس میں لائن بنا کر اندر جاسکتے تھے۔ دونوں طرف روشنیاں تھیں۔ مراد نے کہا "ڈھانچہ دیکھنے کے بعد سامنے عمارت میں آجائیں جہاں میوزیم ہے۔

ہم سرنگ میں داخل ہوئے اور چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ دل میں ایک لمحے کو یہ خیال

نہ کیا کہ کروڑوں ٹن پتھر پہاڑ کی شکل میں ہمارے سر پر رکھے ہیں۔ یہ راستہ ایک بند جگہ پہنچا یہاں ایک عجیب بے ڈھنگا لکڑی کا ڈھانچہ تھا۔ اس میں دیکھنے کی کوئی چیز نہ تھی مراد کا مطلب لکڑی کا ڈھانچہ ہی ہوگا ہم میڈاس کا سمجھے کلے کے پیچھے واپسی کا سفر شروع ہوا۔ جو آرہے تھے وہ دیوار سے چپک کر کھڑے ہوگئے ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ اندر آنے والوں کو ہم بتا رہے تھے وہاں کچھ نہیں لیکن لوگ سرنگ میں داخل ہو گئے تھے۔ دیکھے بغیر واپسی کا کوئی فائدہ نہ تھا باہر نکلے تو کھلا آسمان۔ تازہ ہوا اور زندگی تھی۔ سڑک پر پانی اور کیچڑ تھی اسے پار کرکے عمارت میں پہنچے تو مراد ایک بینچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ سیاح مفت باتھ روم کا فائدہ اٹھانے لگے۔ جب سب لوگ جمع ہوگئے تو مراد نے بتایا" اندر میوزیم میں میڈاس کی لاش اور برابر کے کمرے سے نکلا ہوا سامان رکھا تھا۔ میڈاس عیسائی تھا اس لئے کہ اس کی لاش کے ہاتھ صلیب بنائے ہوئے ہے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لالچ اور پچھتاوے سے مسلمان محفوظ رہے۔

اس میوزیم کا ٹکٹ لاکھوں لیرا کا تھا وہ مراد نے خریدا اور ایک ایک سب کے حوالے کیا۔ اندر کتابوں کا چھوٹا کاؤنٹر تھا جس پر وزارت ثقافت سیاحت کے کتابچے مفت تھے لیکن قیمتاً فروخت ہو رہے تھے۔ ہمیں بادشاہ میڈاس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے بارے میں جان کر کیا کرتے۔

یہ میوزیم دو بڑے کمروں میں تھا۔ جس میں برتن روزمرہ کے استعمال کی چیزیں کانسے کی اشیاء وغیرہ تھیں۔ زیادہ تر برتن صراحی کی طرح بعض کیتلی کی شکل کے تھے پھر مختلف نمونوں کے۔ سانپ کتا، شیر کے چھوٹے مجسمے۔ شاید بچوں کے کھیلنے کے لئے ہوں۔ بڑے چھوٹے پیالے۔ جیسے اکثر بھیک مانگنے کے لئے فقیر استعمال کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے۔ اس زمانے میں لوگ گزر اوقات بھیک مانگ کر کرتے ہوں۔ بوتل نما کوئی چیز شاید بوتل رہی ہو۔ جو کسی گروپ کے جھگڑے میں استعمال ہوئی ہو، گلاس کے ٹکڑے کچھ عجیب سی مہریں۔

ایک بڑے شوکیس میں انسانی ڈھانچہ لیٹا تھا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا یہ بادشاہ میڈاس ہیں۔ اس کے ہاتھوں کی دونوں ہڈیاں سیدھی رکھی تھیں۔ ہمیں تو صلیب کی شکل میں نظر نہیں آئیں۔ مراد اسوقت باہر تھا ہوسکتا ہے۔ جب مراد آتا ہو یہ مجسمہ ہاتھ باندھ لیتا ہو۔ ان کی کسمپرسی دیکھ کر غالب کا شعر یاد آیا۔

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

دنیا بھر کی خلقت آتی ہے اور میڈاس کو اس حال میں دیکھ کر افسوس کرتی ہے۔ ایک الماری میں سونے چاندی کے بھرے سکے نظر آئے۔ یہ تانبے کے زمانے سے رومن دور تک کے تھے۔ ان کا شمار دوسری اور چوتھی قبل مسیح میں ہوتا ہے۔

یہ سارا قبرستان کا علاقہ ہے۔ ہر سال امریکی آثار قدیمہ کے ماہر آتے اور کوئی نہ کوئی انوکھی چیز دریافت کر لیتے ہیں اور سیاحوں کی کشش بڑھ جاتی ہے۔

میوزیم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بادشاہ میڈاس کے ساتھ زیادہ چیزیں تو دفن نہیں تھیں۔ ادھر اُدھر سے جو ملیں وہ بھی شامل کرلیں۔

جب دوبارہ کوچ میں بیٹھے اور روانہ ہوئے تو مراد نے بتایا۔" آثار قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے شاید یہ لاش بادشاہ میڈاس کی نہیں۔ کیونکہ اس کی لاش کے اوپر سونے کا تاج ہونا چاہئے تھا۔"

"وحشت ترے کی کھودا پہاڑ نکلا چوہا"......

پیزا لبکلا وا تھا

ایک دیہات سے گزر رہے تھے تو کوچ رک گئی لاتعداد بھیڑیں اور بطخیں سڑک پار کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ دو تین کتے تھے اور چرواہا کاندھے سے بندوق لٹکائے تھا۔ مراد نے بتایا کتا جانوروں کی رکھوالی کے لیے اور بندوق چرواہے کے پاس جنگلی جانوروں کو بھگانے کے لیے ہے، اس علاقے میں خطرناک بھیڑیے پائے جاتے ہیں۔ اچھی نسل کے کتے بھی پالے جاتے ہیں سردی کی وجہ سے گڈریے نے بہت سے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ترکی میں بھیڑیں، بکریاں، اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کے علاوہ جنگلی جانور بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔ قالین بافی کے لئے ریشم کا کیڑا بھی پالا جاتا ہے۔

بائیں طرف ایک شہر آباد تھا۔ پھر کھیت آ گئے..... ایک دریا گاریا۔ اس کے پل سے گزرے تو ہرے بھرے کھیت لہلہاتے نظر آئے۔ اس علاقے میں کثرت سے گنا، پیاز اور آلو

پیدا کئے جاتے ہیں بھیڑوں سے اون اور گوشت حاصل ہوتا ہے۔ شہر میں کئی مسجدوں کے مینار نظر آئے۔ یہ سرزمین سرسبز ہے۔ ترکی زراعت میں خودکفیل ہے، کھیتوں کھلیانوں کو دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے۔

ایک شہر آ گیا ''اس کی۔'' جس میں 50 ہزار لوگ رہتے ہیں۔ یہاں زیادہ تر کارخانے ہیں۔ گلاس فیکٹری، سرامک ..... اس کے علاوہ چاکلیٹ بھی بنائے جاتے ہیں۔ ہمیں تو کوئی چاکلیٹ کا اسٹور نظر نہیں آیا۔ نہ مراد نے کسی کی سیر کرائی۔

ایک بڑا کارخانہ دکھائی دیا اس پر ''مارک اینڈ اسپنر'' لکھا تھا۔ ہم نے یہ اسٹور لندن میں دیکھے تھے۔ لندن میں ہم پڑھائی دماغ میں اور بارش کپڑوں پر ڈال کر جن مختلف اسٹورز میں پناہ لیتے ان میں ایک ''مارک اینڈ اسپنر'' بھی تھا۔ یہاں غالباً کارخانہ تھا۔ کیونکہ اس نام کا کوئی اسٹور انقرہ میں نظر نہیں آیا۔ کسی دوسرے علاقے میں بھی نہیں ہے۔

''اس کی'' شہر میں ریفریجریٹر اور واشنگ مشین بھی بنائی جاتی تھی۔ ٹیلی ویژن سیٹ بھی تیار ہوتے ہیں..... ترکی میں 80 یونیورسٹیاں اور 350 ملین استاد ہیں۔

ایک یونیورسٹی اناطولو کی اطلاع بھی دی گئی..... ترکی میں تعلیم کا نظام سخت ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں بچے کو اسکول جانا ضروری ہے۔ تعلیم مفت ہے۔ یونیفارم اور کتابیں خود خریدنی پڑتی ہیں نیلے رنگ کا لباس پرائمری کا ہوتا ہے۔ کسی قسم کا مذہبی لباس نہیں لے سکتے۔ اسکولوں میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ بچہ دس سال کا ہو تو اسے انگریزی فرنچ جرمن زبان سکھائی جاتی ہے۔ یونیورسٹی اور کالج میں داخلے کے لئے سخت امتحان ہوتے ہیں بعد کو وہ اپنی پسند کی زبان سیکھ سکتا ہے۔ ترکی کے علاوہ کم از کم ایک زبان ضروری ہے۔ غالباً انگریزی کوئی نہیں لیتا کیونکہ ہم نے یہ زبان کہیں نہیں سنی۔

ایک علاقہ ایسا بھی آیا جس کے کارخانے میں ایف 16 طیارے جوڑے جاتے تھے۔ اب ہم کیا بتاتے امریکہ نے ہم سے ایف 16 طیاروں کی رقم لی اور طیارے نہیں دیئے۔ ترکی والے بچارے کیا کرتے۔ بس ہم ان دیواروں کو حسرت سے دیکھا کئے جن کے پیچھے ہمارے طیارے تیار کھڑے ہوں گے۔ اس علاقے میں زیادہ تر منگولین ترک آباد ہیں۔ ترک اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ منگولیہ سے آئے تھے اور آج بھی اس علاقے میں ترکی زبان بولی جاتی

ہے۔ کبھی منگولیہ جانا ہوا۔ تو اس بات پر کوئی رائے دے سکتے ہیں۔ فی الحال تو سن کر خاموش ہو رہے۔

کوچ کے باہر کے موسم کا تصور کیا اور اندر کے خوشگوار ماحول سے فائدہ اٹھا کر آنکھیں بند کیں اور کھولیں تو ایک شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ بوزگ تھا۔

سڑکیں ٹریفک اور فٹ پاتھ لوگوں سے بھرے تھے۔ سپاہی تھا لیکن نہیں تھا کہ ہر گاڑی اپنی مرضی سے رک رہی اور چل رہی تھی۔ یعنی مکمل جمہوری ٹریفک تھا۔ یہ ماحول اپنا سا لگا اور ہم خوش ہو گئے۔ اطمینان سے بیٹھے تھے کہ خبر ملی ہمیں اپنے لیرے خرچ کر کے اس جگہ دوپہر کا کھانا نوش کرنا ہے۔

ایک بس اسٹاپ کے پاس کوچ رکی اور مراد نے کہا۔ ''جلدی سے اتر جائیں ورنہ چالان ہو جائے گا.....''

ہم نے گھبرا کر پوچھا..... ''ہمارا''

''نہیں کوچ ڈرائیور کا.....''

'' جلدی جلدی..... اس جگہ پارکنگ نہیں ہے.....'' مراد بولا۔

سب اترے تو سامنے ایک ہوٹل کی طرف چلے۔ جس میں اندھیرا تھا مراد کے داخل ہوتے ہی ہر طرف روشنی ہو گئی۔ کاؤنٹر پر اونگھتا ترک اور باورچی خانے میں بیٹھا باورچی ہوشیار ہو گیا۔

اس ہوٹل میں دو باتھ روم مفت تھے۔ اس لئے پہلے بھیڑ اس طرف گئی اس کے بعد مراد نے اشیاء کے نام بتانے اور قیمت سمجھانے میں دیر نہیں لگائی۔ وہاں مچھلی نہیں تھی اس لئے چکن شیش کباب کا آرڈر دیا۔ ایک پانی کی چھوٹی بوتل بھی منگوالی۔

ہماری توقع کے خلاف کباب اچھے تھے۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تازہ تھے اور پانی قیمت سے تھا اس لئے ذائقہ دار تھا۔ کھانا کھا کر لائن بنا کر لاکھوں لیرا ادا کئے تو مراد نے کہا اگر آپ لوگوں کو مقامی رنگ دیکھنا ہے تو جا کر مارکیٹ دیکھ لیں۔'' ایک گھنٹے بعد واپس آ جائیں۔ ہم زیادہ دیر بس اسٹاپ پر رک نہیں سکتے۔''

ای۔ ڈی۔ پہلے ہی الی شا اور اس کی ماں کے ساتھ نکل لیا۔ ہم نے مراد سے پوچھا۔

''مقامی مارکیٹ کس طرف ہے.....؟''

اس نے کہا فٹ پاتھ پر الٹے ہاتھ چلے جایئے۔ آدھے کلومیٹر بعد الٹے ہاتھ کو بازار ہے..... '' یعنی اس شہر میں سب الٹی طرف آتا ہے۔

ہم چل پڑے۔ فٹ پاتھ پر الٹے ہاتھ دکانیں سیدھی طرف سڑک تھی۔ تھوڑی دور چلے تو ایک سڑک پر الٹے ہاتھ بڑا میدان دکھائی دیا اس میں دکانیں لگی تھیں ہم داخل ہوئے تو موٹر کی ٹائر کے برابر روٹیاں اور پیزا جیسی کوئی چیز فروخت ہو رہی تھی۔ اس کے آگے انڈے۔ وہ بھی بڑی تعداد میں پھر سبزیاں۔ زیادہ تر آلو، ٹماٹر، پیاز، کھیرا، پھر دائیں طرف پھلوں کی دکانیں نظر آئیں۔ ہم اس طرف مڑ گئے۔ وہاں پھل تھے۔ زیادہ تر نارنگیاں۔ تھوڑے سے سیب اور ایک دکان پر چند درجن کیلے، انجیر، شلجم اور گاجریں۔

اس مارکیٹ میں انگریزی بولنے اور ترکی نہ سمجھنے والے ہم واحد شخص تھے۔ نارنگیاں تازہ تھیں ہمیں پسند ہیں۔ کئی جگہ فروخت ہو رہی تھیں۔ لیکن یہ اندازہ کرنا تھا کہ یہ میٹھی ہیں یا کھٹی۔ خوش قسمتی سے ایک دکان پر نارنگی کٹی ہوئی رکھی تھی۔ ہم نے دکاندار سے اشارے سے پوچھا۔

''کھا سکتے ہیں.....''

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا..... چکھ کر دیکھی میٹھی تھی..... ہم نے بہت سی اٹھا کر دکاندار کے حوالے کیں اس نے تول کر ایک تھیلے میں ڈال دیں۔ ہم نے جیب سے نکال کر بہت سے نوٹ سامنے کر دیئے۔ دکاندار نے اپنی پسند کے اٹھا لئے..... ہماری شاپنگ ہو گئی۔

واپس ہوئے تو سیلیا مل گئیں وہ کانچ چیز خرید رہی تھیں۔ ٹھرنے اور کلے سے ہائے ہیلو ہوئی..... اس کے بعد ہم سبزی منڈی سے باہر نکلنے لگے تو راستہ نہیں ملا۔ تب احساس ہوا ہر طرف سبزیاں اور فروٹ ہیں اور راستہ غائب۔ مراد کی دھمکی چھوڑ جائیں گے۔'' ایسے میں خدا نے مدد کی اچانک ٹائر کے سائز کی روٹیاں اور پیزا نما چیز نظر آئی۔ اس طرف بڑھے تو سڑک تھی اور ہمارا اطمینان۔ ہر قدم کوچ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مراد کی یہ مراد پوری نہیں ہوگی کہ ہمیں بوزگ میں چھوڑ جائے۔

کوچ میں بیٹھے تو ہر شخص کچھ نہ کچھ خرید کر لایا تھا۔ کلے خالی ہاتھ تھی۔ ہم نے اسے نارنگیاں پیش کیں وہ خوش ہو گئی.....

''آپ نے کیا کھایا''...... اس نے پوچھا
''شیش کباب۔ اچھے تھے......''
''میں نے پیزا منگوایا وہ بکلاوا نکلا......''
ہم دونوں ہنسے اور نارنگیوں پر زور دینے لگے۔

....

ملتان 3870 کلومیٹر

ترکی کے چوتھے بڑے شہر برسا کا پرانا نام بروسا ہے۔ اس شہر کی ایک تعریف یہ ہے کہ یہاں عثمانی بادشاہ سب سے پہلے آئے تھے اور اب آخر میں ہم جا رہے تھے۔ اس علاقے میں سردی تھی۔ دور پہاڑوں پر برف چمک رہی تھی۔ برسا سلک کے لئے مشہور ہے۔ یہاں ریشم کا کیڑا پالا جاتا ہے۔

ایک بڑی بلڈنگ نظر آئی۔ اس میں فیئٹ گاڑی بنائی جاتی ہے۔ جرمن گاڑی رینالٹ فور کا کارخانہ ہے۔ برسا میں تھرمل پاور اسٹیشن ہیں پھر بھی بجلی کی کمی ہے...... ریشم کی پیداوار کی وجہ سے ٹیکسٹائل کی صنعت نے بہت ترقی کی ہے......شہر میں اپارٹمنٹ نظر آتے ہیں۔ ترکی کے بڑے شہروں میں یہی نظام رائج ہے۔ لوگ فلیٹ میں رہتے ہیں سردی سے بچنے کے لئے چھتوں پر ڈیزل کے ڈرم لگے ہیں۔ ہیٹنگ کے لئے اپارٹمنٹ بہت ہیں اور بنگلے بھی ......

برسا شہر میں پہنچ گئے۔ ایک جگہ میکڈونلڈ تھا۔ یہ معروف سڑک تھی بائیں طرف پارک تھا۔ مراد نے کوچ روک دی۔ برسا کی سیر کے لئے۔ پارک کے سامنے ایک سلک...... دوسرا عام بازار تھا۔

مراد نے بتایا۔" دنیا کی بہترین سلک۔ انتہائی مناسب قیمت پر مل سکتی ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد یہاں سے روانگی ہوگی...."

سڑک پار کر کے میکڈونلڈ کے برابر پوسٹ آفس تھا۔ ٹریفک بہت تھا اور سڑک پار کرنا ممکن نہ تھا۔ مراد نے بتایا نیچے ایک کپڑا مارکیٹ ہے۔ اس کے ساتھ انڈر گراؤنڈ راستہ ہے۔ جو سڑک کے دوسری طرف جاتا ہے۔

ہمارا اور دوسرے ساتھیوں کا رخ سلک مارکیٹ کی طرف ہوگیا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک راستہ تھا اور دونوں طرف دکانیں ہمارے ملک کی کوئی بھی معمولی سی مارکیٹ، کپڑا بازار کی طرح۔ ان دکانوں میں کوئی گاہک نہیں تھا۔ دکاندار باہر کھڑے گاہکوں کو دبوچ رہے تھے...... ہم پر بھی حملہ آور ہوئے۔ ایک دکان میں آ ئیڈیا۔ دوسری میں نے اور کلے کام آ گئیں...... باقی بھی ادھر اُدھر پکڑے گئے ان دکانوں میں ریشمی کپڑے انتہائی مہنگے فروخت ہو رہے تھے اور ہماری ساتھی سیاح اس طرح بے چینی اور بے قراری سے کپڑا دیکھ رہی تھیں جیسے پہلی بار انتہائی قیمتی ملبوسات کو اتنے نزدیک سے ہاتھ لگا کر چھونے کا موقع ملا ہو۔ مشرقی عورت شاپنگ کے سلسلے میں یونہی بدنام ہے سچ پوچھیں تو یورپ اور امریکہ کی خواتین بھی اشیاء پر اسی طرح گرتی ہیں جیسے شاعر حسین چہرے پر دیوانہ ہوتا ہے۔ ان دکانوں میں کچھ ایسا فروخت نہیں ہو رہا تھا جس پر ہماری توجہ ہوتی۔ یہاں کشمیرا کپڑا فروخت ہو رہا تھا ہمارا پورے کشمیر پر دعویٰ ہے۔ ایک دو مفلر یا اسکارف لے کر اپنے حق سے دستبردار ہونا گوارہ نہ تھا۔

ہم اپنی دھن میں دکانوں کے شوکیس دیکھ رہے تھے کہ ایک دکاندار نے پکڑلیا۔ زبردستی اندر لے گیا اور کپڑے دکھانے لگا۔ ترکی جاتے ہی ہم نے ایک لفظ سیکھا تھا" کچ پرا۔" یعنی کیا قیمت ہے۔

وہ منہ سے نکل گیا۔ اُدھر سے جو ترکی کی فائرنگ کی گئی۔ اس کا کیا جواب ہوتا ہم نے دکاندار کے ہاتھ جوڑے۔" معاف کرو غلطی ہوگئی آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" پھر اس کی نظر ذرا چوکی

ہم باہر کی طرف لپکے اور ڈر کے مارے سلک مارکیٹ سے باہر نکل لئے سردی تھی۔ سڑک کی دوسری طرف سیاحت کا پروگرام بنایا۔ ایک محراب نما راستہ کی طرف گئے وہاں بہت سی سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں جن پر بلا مبالغہ سینکڑوں مرد و زن اتر رہے تھے چڑھ رہے تھے۔ نہ جانے اتنے لوگ وہاں کیا کرتے ہیں۔ آگے بڑھے تو معلوم ہوا یہ سب سڑک پار کرنے کے مراحل میں تھے۔ سیڑھیوں کے بعد بازار تھا۔ دونوں طرف کپڑے اور دوسری چیزیں فروخت ہو رہی تھیں اس ریلے میں سے دو چار ان دکانوں پر بھی رک جاتے تھے۔ دو ایک خواتین نے ہمیں مسکرا کر دیکھا۔ شاید کچھ کہا بھی ہو۔ اتنے دنوں سے ترکی میں تھے دہی اور کھیرا کھا رہے ہیں۔ مچھلی اور شیش کباب بھی استعمال کئے۔ ہوسکتا ہے۔ ہماری شکل ترکوں جیسی ہوگئی ہو اور یہ سب ہمیں رشتہ دار سمجھ رہی ہوں۔ اس بات کا فیصلہ نہیں کر پائے کہ یہ خوشی کا مقام ہے یا افسوس کرنے کا کہ وہ سیڑھیاں آگئیں جنہیں چڑھ کر سڑک کے دوسری طرف جاسکتے تھے۔ اس لئے گئے۔ وہاں ایک مجمع تھا جو فٹ پاتھ . . دکانوں پر دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے تو ہم میک ڈونلڈ گئے اور مفت باتھ روم استعمال کر کے انہیں ممنون کیا۔ برابر میں پوسٹ آفس تھا وہاں سے فون کارڈ ذرا سی دقت کے بعد مل گئے۔ دوبارہ اسی طرف آگئے جہاں سے آئے تھے۔ سلک بازار کے ساتھ ایک اور بازار نظر آیا۔ وہ ذرا نیچے کی طرف جاتا تھا۔ ڈھلوان راستہ تھا۔ دکانیں خواتین کے ہار سنگھار سے بھری تھیں۔ عجیب طرح کی چیزیں تھیں کنگھے آئینے۔ سستے قسم کے زیورات، بازار کے شروع میں ایک عالی شان مسجد تھی۔ بڑا گنبد، مینار، ہم اس کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ اسی وقت عصر کی نماز ختم ہوئی اور سینکڑوں مرد اور عورتیں باہر نکلنے لگے۔ اتنی بڑی تعداد دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ترکی میں نماز پابندی سے پڑھی جاتی ہے۔ یہ گرین مسجد کہلاتی ہے جو 1421 میں تعمیر ہوئی اور آباد ہے۔

کوچ کی روانگی کا وقت ہوگیا تھا۔ اس لئے سڑک کی طرف آئے۔ کوچ کھڑی تھی۔ ہم فٹ پاتھ پر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگے۔ تب اچانک وہاں لگے پول پر نظر پڑی۔ اُس پر بہت سے ہرے رنگ کے چھوٹے تیر بنے تھے اس پر ملکوں کے نام لکھے تھے اور ان کے سامنے فاصلہ۔ اس میں کازکستان، بلغرایہ، تیونس اور ایک پر لکھا تھا۔" پاکستان ملتان 3870 کلومیٹر" یہ نام دیکھ کر ہم چونک گئے۔ اتنی دور ایک تختی پر ملتان کا نام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ برسا میں سردی

تھی۔ ہمیں ملتان کی گرمی یاد آ گئی۔ وہ ثقافت تہذیب نظروں کے سامنے پھر گئی۔ ملتان ہمیں اتنی دور ملے گا سوچا بھی نہ تھا۔3870 کلومیٹر سفر کریں تو بہت ہیں۔ لیکن دل میں ہو تو کیسی دوری۔ برسا کی سردی غائب ہوگئی اور ہم ملتان پہنچ گئے۔

....

مونٹانیہ کی سرد رات

جس ہوٹل میں قیام کے لئے پہنچے اس کا نام مونٹانیہ تھا۔1849ء میں فرانس کا بنایا ہوا ریلوے اسٹیشن تھا سردی اور ہوا میں شدت تھی۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر استقبالیہ میں سب جمع ہوگئے۔ مراد نے چابیاں تقسیم کی۔ اس بات پر خوشی ہوئی کہ تمام کمرے اس منزل پر تھے یہ اور بات ہے کہ اس موسم میں مونٹانیہ میں صرف ہم لوگ ہی پڑے تھے۔ یہ برسا کے علاقے سودینا میں واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹی بستی ہے جس میں 20 ہزار لوگ رہتے ہیں اس رات یہ تعداد بڑھ گئی تھی ترکی میں بجلی کم ہے۔ مونٹانیہ کے کوری ڈور میں اسی وقت لائٹ جلتی تھی جب کوئی راہ داری سے گزرے۔ ورنہ اندھیرا۔ بجلی بچانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ ہمارا اور رفی، کلے کا کمرہ برابر تھا۔ اس کے ساتھ الی شاہ۔ ای ڈی بہانے سے ایک بار ان کے کمرے میں جاچکا تھا۔ سامان ذرا دیر میں کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ ہم استقبالیہ پر واپس آئے وہاں مراد ایک

میز پر حساب کتاب کر رہا تھا۔ جن لوگوں نے اضافی ٹور لئے تھے ان سے ڈالر وصول کر رہا تھا۔ صالح شیخ کو برسا کا بازار بے حد پسند آیا تھا وہ وہاں جانا چاہتا تھا۔ مراد نے بتایا۔

"یہاں سے 45 منٹ کا راستہ ہے ۔۔۔ اور ہوٹل سے ٹیکسی منگانی پڑے گی۔"

یہ سنا تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہم نے برادر ملک مصر کے باشندے ہونے کی حیثیت سے صالح شیخ کو سمجھایا "اگلی بار آؤ تو برسا میں ٹھہر جانا"

اس کی آرزو دور ہوئی اور وہ نے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہوٹل سوکانیہ کے لاؤنج میں ایک جل پری اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ بیٹھی تھی ہم کمرے میں پہنچے تو باہر سے آواز آئی۔

"میں اندر آ سکتی ہوں۔" ہم نے سوچا جل پری آ گئی۔ پھر جو اندر آیا وہ ای شا تھی۔ اسے ہم سرد رات میں مجبوراً بھی جل پری نہیں سمجھ سکتے تھے۔

"ای۔ ڈی ۔ باہر استقبالیہ میں بیٹھا ہے۔"

"مجھے آپ سے کام ہے۔" وہ سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ہم اسے ای ڈی کی وجہ سے پسند نہیں کرتے تھے۔ اب جو تنہائی میں دیکھا تو صحیح خدوخال کی لڑکی تھی اور اس وقت ہمارے پاس کام سے آئی تھی۔ ای۔ ڈی دیکھ لے تو اس سرد شام کو اپنی توند کم کرنے کے لئے باہر دوڑ لگانے لگے گا۔

"کیوں کیا بات ہے۔" ہم نے پوچھا۔

وہ مسکرانے لگی۔ پھر بولی "میری ممی کی سالگرہ ہے۔"

"مبارک ہو"

"آپ سے کام ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ میں لٹکایا ہوا بیگ کھولا۔

ہم سمجھ گئے یہ اس میں ڈالر مانگے گی۔ اسی لئے اکیلی آئی اور مسکرا رہی ہے۔ اس نے ایک کارڈ نکالا۔ ہمارے بیڈ کی طرف آئی۔ ایک قلم دیا۔ اور کہا۔

"اس پر دستخط کر دیجیے۔۔۔"

ہم نے کارڈ دیکھا۔ اس پر پہلے ہی بہت سے لوگوں کے دستخط تھے۔

"اور گفٹ ۔۔۔"

"ہم نے کیک کا آرڈر دے دیا ہے۔ ڈنر کے بعد کاٹیں گے۔"

ہم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے تھے۔ جب کارڈ پر دستخط کر رہے تھے وہ ہم پر جھک گئی۔ یہ اس کا انداز تھا جسے ای ڈی دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔

کارڈ ہم سے لے کر اس نے تھینک یو کہا اور ہاتھ ملا کر چلی گئی۔ اتنے میں ای ڈی آ گیا۔ وہ ای شا کو کمرے سے نکلتے دیکھ چکا تھا۔

"ای شا آئی تھی۔۔۔" اس نے پوچھا

"ہاں مساج کے لئے آئی تھی۔ تم نہیں تھے۔ ہم نے کر دیا۔۔۔"

"کیا کیا۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا اور کمرے سے نکل کر چلا گیا۔ بارش شروع ہو گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ ڈنر ساڑھے سات بجے تھا۔ اس کے لئے باہر نکل کر دوسری عمارت میں جانا تھا۔ تیز ہوا بھی تھی۔ سب بھاگ کر دوسری عمارت میں پہنچے تو ایک بڑا ہال۔ درمیان میں چھت سے لٹکا گیس کا ہیٹر۔ جس سے برائے نام گرمی ہو رہی تھی۔ لیکن اتنا تیز روشن تھا کہ دیکھ کر ہی اطمینان ہو رہا تھا۔ سب لوگ اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ مراد نے بتایا پہلے اس جگہ ریلوے اسٹیشن تھا۔ ہال کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اسی قسم کی کوئی نامی گرامی تاریخی جگہ ہوگی۔ یہ سن کر ہمیں خطرہ محسوس ہوا کہ لوگ یہاں ریل کا انتظار کرتے ہوں گے۔ ہمیں کھانے کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ لیکن فوراً سوپ دیا جانے لگا۔ یہ گرم لسی تھی جس کے اوپر زیتون کے تیل کا بگھار تھا۔ ہم نے کالی مرچ ڈال کر نوش کیا۔ کچھ زور ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر دیا کہ آنے والے کھانے کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ تھی اور ایسا ہی ہوا۔ وہ پکا وا نکلا۔ ٹماٹر میں پانی اس میں پیاز اور شاید چکن کی بوٹیاں جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سلاد بھی تھی وہ ہماری خوراک میں کوشش کے باوجود کبھی شامل نہ ہو سکی۔ ترکی میں یہ ہر پرہیزی کیوں کرتے۔ اب صرف سویٹ ڈش کا انتظار تھا۔ پہلے ایک پلیٹ سب کے سامنے رکھی گئی اور پھر آدھے کلو سے زیادہ وزن کا سفیدی مائل سیب اور ایک چھری دی گئی لو صاحب سویٹ ڈش نوش کرو۔ ہم نے چھری سے ٹکڑے کئے اور ایک کھایا تو اس کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے کے لئے دوسرے ساتھیوں کو بھی دعوت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان میں سے کسی نے رغبت سے سیب نہیں کھایا۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ کہ سیب بدذائقہ تھا۔ بس ہمارے منہ کا مزہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اس بات پر دل میں آزردہ ہونا چاہتے کہ ای شا کی آواز آئی وہ سب کو ایک میز کے گرد بلا رہی تھی۔ اپنی ممی کی

سالگرہ کے لئے اس نے میز پر ایک بڑا کیک رکھا تھا جسے الی شا کی ماں نے تالیوں کی گونج میں کاٹا۔۔۔ پھر "ہیپی برتھ ڈے" گایا گیا۔ سب نے الی شا کی ماں سے ہاتھ ملایا۔ بعض نے گالوں پر پیار بھی کیا۔ ہم ان نوازشات سے محروم رہے۔ الی شا کی ممی نے ہم سے ہاتھ ملایا اور گرم جوشی سے الی شا نے بھی۔ یاروں نے اس بہانے الی شا کے گال بھی چوم لئے......اور ایک ہم رہ گئے۔ دراصل مینا اسی کی ہے جو بڑھ کر اٹھائے۔ ہمارے پسندیدہ شاعر نور بجنوری نے کہا ہے۔

شاخ شاخ پر موسم گل نے گجرے سے لٹکائے تھے

جونہی میں نے ہاتھ بڑھایا سارے پھول پرائے تھے

سچ پوچھیں تو اس قسم کی بے ہودہ رسموں اور روایتوں کے ہم قائل ہی نہیں۔ پھر کردار بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔۔۔

اپنے کمرے کی طرف آئے تو دروازہ کھٹکھٹا کر کلے نے بلالیا۔ وہ الی شاہ کی ممی کی سالگرہ کی خوشی میں کافی پلا رہی تھی۔ کمرے میں جگہ نہیں تھی اس لئے سب موٹانیہ کے چھوٹے ریسٹورنٹ میں آبیٹھے۔ پھر لطیفے اور قصے سنائے گئے۔ باہر سرد ہوا تھی اور اندر زندگی کی حرارت سے بھرپور توانا چہروں والی لڑکیاں اور مرد ہنس رہے تھے۔ خوش ہو رہے تھے۔ کافی کی مہک ہر طرف پھیل رہی تھی۔ زندگی انہی لمحوں کا نام ہے۔۔۔ جو اللہ چاہے تو ہر دن روشن کرسکتا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

****

زلزلے کا علاقہ

صبح ناشتے کے بعد استنبول روانگی تھی

چھوٹی بستیوں، کھیتوں اور باغوں کے درمیان گزرتے ایک ایسے علاقے میں آئے جو ترکی میں زلزلے کا علاقہ ہے۔ اس بستی کا نام یلووا ہے اور سارا علاقہ ازمت کہلاتا ہے۔ یہاں ہر سال زلزلے سے ہزاروں انسان مرجاتے ہیں۔ مکانات تباہ ہو جاتے ہیں۔

اس سال بھی زلزلہ آیا تھا دیکھتے دیکھتے 17 ہزار افراد عمارتوں کے نیچے دب کر مرگئے۔ سڑکوں میں دراڑیں پڑگئیں۔ کوچ کی رفتار کم ہوئی تو دیکھا دونوں طرف اپارٹمنٹ تھے جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کی دیواروں میں سوراخ تھے۔ بعض آدھے گر گئے تھے۔ یہ کئی منزلہ تھے۔ جو لوگ زلزلے سے بچ رہتے ہیں بے حد خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ ہم نے دیکھا سڑک کے کنارے بہت سے لوگ کپڑے سے بنے مکانوں میں زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں جھونپڑیاں کہہ سکتے ہیں۔

مراد کا کہنا تھا ایک بار تو زلزلہ اس طرح آیا اور وہ تباہی پھیلی جیسے جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاسا کی میں جنگ عظیم دوئم میں ایٹم بم سے ہوئی تھی۔ یہ زلزلے کا علاقہ ہے۔ زمین کے نیچے لاوا کروٹ بدلتا ہے تو زمین ہل جاتی ہے یہ قدرتی آفت ہے۔ اس شہر میں زیادہ منزلوں کے اپارٹمنٹ بنانے کی ممانعت ہے۔ لیکن ترکی میں رشوت کا رواج ہے۔ مراد کا کہنا تھا جو لوگ عمارتیں بنانے کی اجازت دیتے ہیں وہ رشوت لے کر کمزور عمارتوں کو بھی منظور کر دیتے ہیں۔ زیادہ منزلیں بنانے کا لائسنس جاری کر دیتے ہیں ناقص سامان استعمال کرنے کی وجہ سے عمارتیں کمزور ہوتی ہیں اور زلزلے کے وقت مالی اور جانی نقصان پہنچاتی ہیں۔

دنیا بھر سے امداد آتی ہے ..... امریکہ خاص طور سے توجہ دیتا ہے۔ لیکن تباہی سے کون بچا سکتا ہے۔ ازمت کا علاقہ بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے اس لئے سب کی مدد نہیں ہو سکتی۔

زلزلے کے اثرات دیکھ کر اور تباہی سن کر سب ہی افسردہ ہو گئے کوچ اس خطرناک علاقے سے نکلی تو ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی ترکی کے بہت سے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہمارے ساتھی اندر جا کر چائے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ باتھ روم استعمال کرنے لگے۔

باہر سردی اور اندر موسم خوشگوار تھا کچھ دیر رک کر دوبارہ سفر شروع ہوا۔ قصبے، گاؤں، دیہات اور کھیتوں کے درمیاں ایک ایسی بستی آئی جس کا نام توپ کرا تھا۔ یہ ایشیاء کی سرزمین میں آخری قصبہ ہے۔ اس کے بعد مرمر سفر اور یورپ کا شہر استنبول واقع ہے۔ سمندر پار کرنے کے لئے کوچ ایک فیری میں جا کھڑی ہوئی اور فیری نے سمندر کرنا شروع کر دیا۔ اوپر ایک ڈیک تھا جو سیڑھیاں چڑھ کر آتا تھا۔ بعض سیاح اوپر چڑھ گئے۔ لیکن جلد واپس آ گئے۔ سرد ہوا نے انہیں کوچ میں واپس کر دیا۔ ہم کھڑکی کے شیشے سے لگ کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ اس بار راستہ لمبا ہے۔ فیری سمندر کو پیچھے دھکیلتی آگے بڑھتی رہی۔ 45 منٹ بعد کوچ ایک سڑک پر آ گئی۔ ایشیا پیچھے رہ گیا۔ ہم یورپ میں داخل ہو گئے۔ ہماری منزل استنبول تھا۔ ترکی کا سب سے بڑا اور مصروف شہر۔

استنبول سمندر کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ انہیں 174 میٹر لمبا پل ملاتا ہے۔ مراد نے بتایا اسے امریکیوں نے بنایا۔ خوشی ہوئی۔ امریکہ نے کچھ تو بنایا۔ ورنہ اکثر ملک بگاڑنے کی

خبریں زیادہ سناتے ہیں۔ اس کی اونچائی 65 میٹر ہے۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ سمندر میں ابال آ جائے تو ..... دوسری وجہ اس کے نیچے سے سمندری جہاز گزرنے کی بھی ہے۔ اس پل پر پیدل نہیں چل سکتے۔ ہمیں یہ اطلاع اس لئے دی ہو گی کہ ٹور چھوڑ کر خود سیر کو نہ نکل جائیں۔

مراد نے سب لوگوں سے پوچھا۔ ''استنبول بائی نائٹ ٹور کون لے گا.....'' ہر ایک خاموش تھا۔ صرف صالح شیخ نے ہاتھ اٹھایا .. مراد نے دوسرے ٹور کے بارے میں پوچھا استنبول کا فیری ٹور کون لے گا... '' اس بار بھی صالح شیخ سب سے آگے تھا۔ اس طرح دونوں ٹور منسوخ ہو گئے۔

پل پار کر کے یورپ میں داخل ہو گئے۔ دونوں طرف اپارٹمنٹ شروع ہو گئے ایک سرنگ آ گئی۔ صاف ستھری سڑک، جب سمندر پار کر لیا تو مراد سمندر کے بارے میں بتانے لگا۔ کئی سیاحوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ہم نے زندگی بھر ماضی کو یاد نہیں کیا۔ اس سے حال کا وقت ضائع ہوتا ہے لہٰذا سامنے دیکھتے رہے۔

ہم خیر الدین باربروسا سڑک پر جا رہے تھے۔ یہ ترکی کا نامی گرامی امیر البحر تھا۔ اسی سڑک پر ایک جگہ وہ سو رہا تھا۔ اس کا مجسمہ بھی نظر آیا۔ باربروسا کا مطلب سرخ داڑھی والا ہے۔ یہ چند جہازوں کے ساتھ بحیرہ روم میں تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتا تھا۔ پھر ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہونے لگا اور ایک دن الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ قبضہ مستقل نہیں رکھ سکتا ہے۔ ترکی کے سلطان سلیم کی فرماں برداری قبول کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی اسپین میں مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔ اس نے اپنے جہازوں سے اندلس سے ستر ہزار مسلمانوں کو الجزائر پہنچا دیا۔ خلیفہ سلیمان جب تخت نشین ہوا تو اس نے خیر الدین باربروسا کو عثمانیہ بحریہ کا امیر الاعظم مقرر کیا۔ جس نے تیونس پر قبضہ کر لیا۔ اپنی شجاعت اور بہادری سے عثمانیہ سلطنت میں بہت اضافہ کیا۔ بحر احمر، بحرہ روم اور بحر ہند میں اس کی قوت کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اسے علم و فنون کی سرپرستی کا شوق اتنا تھا کہ اپنی دولت کا بڑا حصہ ایک کالج قائم کرنے میں لگایا۔ ایک طرف عثمانی بادشاہوں کا قلعہ نظر آیا۔ سنا ہے اس میں اتاترک نے آخری سانسیں لیں۔ 10 نومبر 1938، 9 بجکر پانچ منٹ پر۔ اس دن ترکی گھڑیاں چند لمحوں کے لئے روک دی جاتی ہیں۔ اس طرح 62 سال میں تو گھڑیوں میں بڑا فرق ہو گیا ہو گا۔'' مراد کے پاس اس سوال کا

جواب نہ تھا۔

دائیں طرف 16 ویں صدی کی ایک خوبصورت مسجد نظر آئی۔ موسموں نے رنگ اڑا دیا تھا۔ دیواروں پر دھول جمی تھی۔ بائیں طرف ترکی کا بہترین فائن آرٹ کا اسکول۔

ایک جگہ حریت اور ملت کا نام لکھا تھا۔ ہم سمجھے یہ ہمارے ملک کے اخباروں کے دفتر ہیں۔ مراد نے بتایا یہ تجارتی کمپنیاں ہیں۔ ایک اور کائی زدہ اڑی رنگت اور سیکولر ملک کا ماتم کرتی مسجد نظر آئی۔ نمازیوں سے آباد، پانچوں وقت اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرتی۔

سینٹ جون چرچ، سیڑھیاں، پھول...... گھاس...... اور پھر مسجد سلیمانیہ ٹریک کا نظام دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ اپنا ملک یاد آ گیا۔ جہاں جی چاہے پارک کرو جس سمت چاہے موڑ لو۔

ایک بڑا چوراہا...... دکانیں۔ لوگوں کا ہجوم۔ یہ تکیسی ان چوک ہے...... اس جگہ پوسٹ آفس۔ میکڈونلڈ۔ بینک مشہور حاجی بابا کا ریسٹورنٹ جو ترکی کے خاص اور لذیذ کھانے بناتا ہے۔

ایک سڑک سے دوسری سڑک پر آئے۔ ایک اور میکڈونلڈ...... اور دوسری گلی میں ہوٹل "کاروان سرائے۔" ہر طرف دکانیں، روشن ہوٹل اور فٹ پاتھ انسانوں سے بھرے۔

استنبول میں طعام و قیام کا آغاز ہوگیا۔

....

حضرت ایوب انصاریؓ کے روضے میں موئے مبارک

استنبول میں میزبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ایوب انصاریؓ کا قیام ہے۔ حدیث نبویؐ ہے۔ "جو استنبول فتح کرے گا۔ وہ جنت کا حقدار ہوگا۔" حضرت عثمان غنی کے زمانے میں مسلمانوں کا ایک لشکر استنبول فتح کرنے نکلا تو حضرت ایوب انصاریؓ ان کے ساتھ شریک تھے۔ بزرگ تھے اور استنبول کے نزدیک محاصرے کے دوران وفات پاگئے۔ مرنے سے پہلے آپ نے وصیت کی تھی۔ مجھے دشمن کی زمین پر جہاں تک لے جاسکتے ہو۔ دفن کر دینا۔ ان کی یہ وصیت پوری کی گئی۔ استنبول کے قلعے کے باہر مزار بنایا گیا اور دشمن سے کہا...... یہ ہمارے محترم بزرگ ہیں۔ ان کی قبر کو نقصان نہ پہنچانا۔

خلافت عثمانیہ کے ساتویں خلیفہ محمد فاتح نے 29 مئی 1453ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ تیسرے دن انکشاف ہوا کہ حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار قلعہ کے باہر ہے جنہوں نے 48ھ کے محاصرے کے دوران وفات پائی تھی اور فصیل کے برابر دفن ہوئے تھے۔ سلطان نے فوراً وہاں ایک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا اور خود اس کی نگرانی کی۔ اس مسجد کی تکمیل کے بعد" جامع ایوب"

نام رکھا گیا اور اس دن سے یہ دستور بنا کہ تخت نشینی کے موقعے پر سلطان اس مسجد میں جا کر عثمان اول کی تلوار اپنے گلے میں ڈالتا اور اس روایت کو رسم تاج پوشی کے قائم مقام سمجھا جاتا تھا۔ سلطان محمد ثانی فاتح کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ جہاں صحابہ کرام کا خون گرا تھا۔ وہ شہر فتح کر لیا۔

استنبول ہم دوپہر کو پہنچے اور آج شام خالی تھی۔ کاروان سرائے میں کھانے کا انتظام تھا۔ لیکن افطار کے وقت۔ ہم حضرت ایوب انصاریؓ کے روضے پر جانا چاہتے تھے۔ وہاں جانے اور آنے کے فاصلے کا اندازہ نہ تھا۔ اس لئے رات کا کھانا کسی اور جگہ کھایا جا سکتا تھا۔

ہم نے مراد سے مسجد ایوب کا راستہ پوچھا اس نے بتایا ''ٹیکسی سے چلے جائیں۔ استنبول کے ٹیکسی والے ٹھیک لوگ نہیں۔ کرایہ زیادہ لیتے ہیں لیکن اور کوئی طریقہ نہیں۔''

ہم نے بتایا.... ''جامع ایوب'' جانا ضروری ہے چاہے کچھ بھی خرچ ہو۔''

مراد نے کہا۔

''کاروان سرائے سے وہاں جانے کا کرایہ ٹیکسی سے 30 لاکھ لیرا۔ لگے گا۔''

سامان کمرے میں رکھ کر ہم نے ای ڈی سے کہا۔ ایک بے حد اہم جگہ چلنا ہے ہمارے ساتھ چلو...... ''وہ تھکنے کا بہانہ کرنے لگا حالانکہ کوچ میں ساتھ ہی آئے تھے۔ پھر پیٹ پر ہاتھ مارنے لگا۔ ایک بار سر کو بھی ہاتھ لگایا۔ ہم نے اس کی حالت دیکھی تو صاف پوچھا۔'' ہمارے ساتھ چلتے ہو تو فوراً جوتے پہنو ورنہ جہنم میں جاؤ......''

اس نے ایک لمحہ کو سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ فی الحال جہنم میں نہیں جائے گا...... اس لئے بولا۔ ''چلو''۔

ہم نے اسے بتایا'' آنے جانے کا کرایہ ہم دیں گے ... تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

ای ڈی چپ رہا۔ ہم نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر ایوب سلطان مسجد کے بارے میں پوچھا۔ استقبالیہ پر خاتون نے کہا۔'' آپ کو ٹیکسی منگا دیتے ہیں۔''

''وہ مسجد تک کیا چارج کرے گا۔''

''غالباً 30 یا 40 لاکھ لیرا۔''

بیرا ہوٹل کے باہر گیا اور چند لمحوں میں ٹیکسی لے آیا۔

ہم نے ہوٹل کے پتے کا کارڈ لیا اور اس کی پشت پر ترکی میں ایوب سلطان مسجد لکھوا لیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو دکھایا۔

ہم نے پوچھا .... ''انگریزی بول سکتے ہو... ''

اس نے ترکی میں جواب دیا... جس کا مطلب یقیناً یہ ہوگا۔'' جس طرح آپ ترکی نہیں بول سکتے میں انگریزی سے ناواقف ہوں۔''

ٹیکسی معروف بازاروں سے گزر کر ایک پل پار کر کے صاف ستھرے علاقے میں داخل ہوئی۔ ذرا نیچے ایک قبرستان تھا۔ پھر سڑکیں ... اور ایک بات خاص ٹریفک انتہائی تیز رفتار تھا .. ایک ایسا علاقہ بھی آیا جہاں دونوں طرف مکانات تھے۔ لیکن یہاں بھی ٹریفک ہوا کی طرح اڑا جا رہا تھا۔

ہمارا خیال ہے۔ اس علاقے میں اگر کسی کو اس لڑکی سے عشق ہو جاتا ہوگا جو دوسری طرف رہتی ہوگی تو زندگی بھر سڑک پار نہ کرنے کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ پاتا ہوگا۔ کراچی کے بارے میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ...ایک صاحب بہت دیر سے تیز رفتار ٹریفک پار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دیکھا سڑک کے دوسری طرف ایک صاحب کھڑے ہیں انہیں تعجب ہوا۔ چیخ کر پوچھا .... '' آپ اس طرف کیسے پہنچے .....''

''میں اسی طرف پیدا ہوا ہوں......'' ان صاحب نے زور سے چیخ کر جواب دیا۔

استنبول میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

ہم دیر تک دیکھتے رہے۔ کوئی سڑک پار کرنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ جب لوگ ایک طرف سے دوسری طرف نہیں جاتے تو کام کیسے چلتا ہے۔

ہم جب تک ٹیکسی میں بیٹھتے ہیں۔ اکثر میٹر کی رفتار کی طرف دیکھتے رہے ہیں۔ یہ پہلا سفر تھا جب ہم نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ کیونکہ سفر پیشہ کا تھا جس کے لئے ٹیکسی والا جو چاہتا وصول کر لیتا۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد...... اسے ایوب سلطان مسجد کا نام دکھا دیتے تھے۔ تاکہ وہ بھول نہ جائے خاصی دیر سفر کے بعد اس نے ٹیکسی سڑک کے کنارے روک دی۔ جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم نے 50 لاکھ لیرا کا نوٹ دیا۔ پہلے تو اس نے ذرا دیر کی ہم اتر جائیں پھر ایک لاکھ کا نوٹ دیا۔ جہاں ہم اترے وہاں دونوں طرف دکانیں تھیں۔ لوگوں کا ہجوم تھا جو ایک طرف

سے آرہا تھا ..... عصر کی نماز ختم ہوئی تھی۔ میدان میں بڑا خیمہ لگا تھا۔ اس طرف خواتین اسکارف لگائے کھڑی تھیں۔ مرد حضرات بھی تھے۔ ہم نے ایوب سلطان مسجد کے بارے میں پوچھا..... کوئی نہ بتا سکا۔ سامنے ایک میدان تھا۔ جس میں درخت لگے تھے۔ درمیان میں گول عمارت تھی اور اس کی پشت پر ایک بڑی مسجد۔ اس کے باہر عورتوں اور مردوں کا ہجوم تھا۔ جو ایک طرف سے اندر داخل ہوکر دوسری طرف سے نکلتے تھے۔ یہ میزبان رسولؐ حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار تھا۔ ہم نے دروازے پر جوتے اتارے اور ای ڈی سے کہا..... ان کا دھیان رکھنا اور اندر داخل ہوئے۔ زمین پر قالین بچھے تھے اور درمیان میں مزار تھا اوپر سے نیچے تک سنہرا کام تھا۔ مزار اونچا بنا ہوا تھا۔ اس پر سنہری چادریں تھیں۔ بہت سے لوگ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ دو آدمی پہرہ دے رہے تھے۔ ہم نے فاتحہ پڑھی۔ ان سے اپنے لئے دعا کرنے کی درخواست کی۔

اتنی دور سے سفر کرکے آئے تھے۔ ترکی کا سفر بامقصد ہوگیا۔ ہم ان کے سامنے سے ہوکر تصور کرنے لگے جب مدینہ کا ہر شخص رسالت مآبؐ کو مہمان بنانا چاہتا تھا اور حضرت حمزہؓ نے کہا۔ حضورؐ کی اونٹنی جس گھر کے سامنے جاکر رکے گی۔ رسولؐ اس کے مہمان ہوں گے۔ حضرت ایوب انصاریؓ کیسے نصیبوں والے تھے کہ اونٹنی ان کے گھر کے سامنے رکی اور وہ رہتی دنیا تک میزبان رسولؐ کا لقب پاگئے۔ ہم نے مدینہ جاکر مسجد نبویؐ کے نزدیک حضرت ایوب انصاریؓ کا گھر دیکھا تھا اور ان کا مستقل گھر دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی مقدر کی بات ہے۔

ہم دیر تک کھڑے رہے پھر پہریدار سے کیمرہ دکھا کر تصویر کی اجازت مانگی جو نامنظور ہوئی۔ لیکن ہم یہ پورا منظر دل میں اتار چکے تھے اور جب ہر طرف تاریکی چھا جائے گی تو یہ منظر روشن ہو جائے کہ انہیں نسبت رسولؐ ہے اور جسے ان سے نسبت ہے۔ ان پر بھی ہمارا سب کچھ نچھاور باہر نکلے تو ہلکی تاریکی چھانے والی تھی۔ خیمے کے باہر خواتین نے لائن بنالی تھی۔ روزہ افطار کا وقت تھا۔ مقامی بلدیہ کی طرف سے ہر روزہ دار کو افطار اور کھانا مفت ملتا ہے۔ دکانوں کے باہر اور میدان میں ہر طرف مرد و زن نظر آرہے تھے۔ ہم مسافر تھے دیکھنے اور چلے آنے کے لئے گئے تھے اس لئے ''کاروان سرائے'' کی طرف واپس ہوئے۔

****

نیلی مسجد

آج استنبول کی سیر تھی۔ یہ شہر آدھا یورپ اور آدھا ایشیاء میں ہے جس طرح سندھ اور بلوچستان کے بہت سے گاؤں آدھے پاکستان اور آدھے ہندوستان میں ہیں۔ استنبول کے دونوں علاقوں پر ترکی کی لامذہب جمہوریت کی حکومت ہے۔ دونوں حصوں کو ایک پل ملاتا ہے۔ استنبول کا یورپی حصہ۔ تجارت، سفارت، سیاست کے لئے مشہور ہے اور ایشیاء کا علاقہ رہائش اور پرانی یادگاروں کو سنبھالنے کے لئے موجود ہے۔

رومن کے زمانے میں اس کا نام قسطنطنیہ تھا..... جب عثمانی خلیفہ نے فتح کیا تو اسے استنبول کا نام ملا۔ ان دنوں اس کی آبادی بے شمار ہے۔ روزگار اور تجارت کے لئے دیہاتوں کے لوگ یہاں آرہے ہیں اور آتے جا رہے ہیں یوں سمجھیں ترکی کی آبادی کا ہر پانچواں آدمی یہاں موجود ہے۔ اس لئے پہلے ترکی کی آبادی معلوم کریں اسے پانچ سے تقسیم کریں تو استنبول

کی آبادی کا حساب ہو سکے گا۔ لیکن اس جمع تفریق میں کون پڑے گا۔ ترکی والوں کا کہنا ہے کہ اس شہر کو اٹلی کے روم سے مناسبت دی جاتی ہے...... جہاں رومن تعمیر کے بہترین نمونے آج بھی ملتے ہیں۔ استنبول میں عثمانیہ دور خلافت کی تعمیر حیرت انگیز ہے...... اس شہر میں حسن ہے۔ نائٹ کلب، بہترین ذائقے دار کھانے...... نیلے ساحل اور پری چہرہ لوگ۔ اس لئے ہر طرف سے سیاح کھنچے آتے ہیں اور یہاں رہنے والے کہتے ہیں کہ استنبول کے حسن نزاکت سے لطف اندوز ہونے کے لئے کم از کم ایک ہفتہ قیام و طعام کریں۔ ہمارا قیام چند دن تھا۔ اس کی ذمے داری مراد کے سر تھی۔ جو اسے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ ہمارے بعد دوسرے سیاح کو بھی آنا ہے۔

استنبول پرانا شہر ہے۔ اس کی ابتدا تانبے کے دور سے ہوئی ...... اور اس شہر پر ہر اس قوم کا قبضہ ہوتا رہا جو طاقتور تھی۔ 666 سے 870 تک عربوں نے بھی اس شہر کو فتح کرنے کی بہت سی کوششیں کیں۔ آخر محمد دوئم عثمانی خلیفہ نے 1453ء میں اس شہر کو فتح کرلیا اور قسطنطنیہ کی جگہ استنبول نام پڑا۔ قسطنطنیہ ایک رومن بادشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ مصر فتح ہونے کے بعد استنبول اسلام کا مرکز بن گیا 15 مارچ 1919ء کو جنگ عظیم اوّل میں اتحادی فوجیوں نے شہر پر قبضہ کرلیا۔ لیکن ترکی کے لوگوں کی جنگ نے استنبول کو دوبارہ آزاد کرایا۔ سلطنت عثمانیہ کو جمہوریت میں بدل کر دارالخلافہ استنبول سے انقرہ لے جایا گیا۔ لیکن اس کی ترقی اور تعمیر میں کوئی فرق نہیں آیا۔

آبادی کے حساب سے استنبول دنیا کا 9 واں بڑا شہر ہے۔ یہاں ہزاروں فیکٹریاں ہیں جن میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ 1500 بینک 1000 ہوٹل اور 4500 ریسٹورنٹ اور 50,000 کیفے ہیں۔ 1800 بیکریاں اور 135000 سبزی کی دکانیں 36000 نائی کی دکانیں ہیں۔

70 ہزار شادیاں۔ 40 ہزار اموات۔ 5000 طلاقیں۔ 35000 افراد ٹریفک حادثات میں مرتے ہیں۔ 2800 مسجدیں، 120 چرچ موجود ہیں۔ 35 میوزیم۔

اتنے بہت سے مقامات تو استنبول میں رہنے والوں نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے اس لئے ہم آزردہ نہیں ہوئے۔ بہت سی چیزوں سے ہم نے اتفاق نہیں کیا۔ مثلاً ٹریفک سے مرنے

والوں کی تعداد اس سے زیادہ ہوگی۔ اس لئے کہ ٹریفک کا جو حال ہے۔ اس میں جتنے لوگ چاہیں دیہاتوں سے آجائیں آبادی پر زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔

صبح 8 بجے کارواں سرائے سے نکلے تو دیکھا رات کسی وقت بارش ہو چکی تھی اور سڑکیں صاف ستھری تھیں۔ استنبول پہاڑی علاقے پر تعمیر ہے اس لئے سڑکیں اونچی نیچی ہیں۔ شہر میں ٹرام چلتی ہے۔ کہیں سڑک کے درمیان ذرا سی دیوار اٹھی ہے جس کے درمیان ٹرام کی لائن ہے۔ ورنہ پٹریاں سڑک پر نظر آتی ہیں۔ اسٹیشن ایک اونچا پلیٹ فارم ہے جو سڑک کے کنارے بنا ہوتا ہے۔ لوگ دونوں طرف سے مشین میں ٹکٹ ڈال کر آتے ہیں۔ چاہیں تو سڑک سے بھی پلیٹ فارم پر چڑھ سکتے ہیں ہمارے سامنے ایسا نہیں ہوا۔ ہمارے تکلف میں تاثر اچھا رکھنے کے لئے۔ یا شاید لوگ بے حد ایماندار ہیں۔ ایک بات ضرور ہے ہم نے ایک بھی بھیک مانگنے والا نہیں دیکھا۔ مخالفین کہہ سکتے ہیں کہ حکومت عالمی بینک کے سامنے اتنا ہاتھ پھیلاتی ہے کہ عام آدمی کو شرم آتی ہے۔ یا ضرورت نہیں پڑتی۔

ہماری کوچ ایک اوپر جاتی سڑک پر چڑھ گئی۔ یہاں شہر کے میئر کا گھر تھا۔ باہر سے دیکھا۔ مسجد کے پاس خیمہ لگا تھا۔ شام کو لوگ یہاں جمع ہوں گے اور میونسپلٹی کی طرف سے افطار کھانا مفت۔

ہماری منزل ''نیلی مسجد'' تھی۔ اسے نہ جانے کیوں نیلی مسجد کہتے ہیں حالانکہ اس میں کوئی چیز نیلی نظر نہیں آتی۔ یہ سلطان احمد مسجد۔ خلیفہ سلطان احمد نے بنوائی تھی جس نے 1603ء سے 1617ء تک حکومت کی۔ اس کی تعمیر 1909 میں انجینئر محمد آغا نے شروع کی اور 1616ء میں مکمل ہوئی۔ مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ، اسپتال، بازار، اسکول، کاروان سرائے اور عوام کے لیے چشمہ بنوایا۔ اسپتال اور کاروان سرائے 1900ء میں برباد ہوگئے۔ اس کے بعد بہت سی مسجدیں تعمیر ہوئیں لیکن سلطان احمد مسجد کی تزئین تعمیر اور جاہ و جلال کو نہ پہنچ سکیں۔ یہ مسجد شہر کے مرکز میں بنی ہے اور بہت سی پرانی عمارتوں کو ہٹا کر یہ جگہ بنائی گئی تھی۔ شاہی محل کے نزدیک ہے۔ اس کے اندرونی حصے میں 21 ہزار سے زیادہ ٹائل لگائے گئے ہیں جو ازمت کے علاقے سے آئے تھے جو ٹائلوں کے لئے مشہور ہے۔ اندر حسین خوبصورت قالین ترکی کے مختلف علاقوں سے منگائے گئے تھے اور آج بھی وہی دستور جاری ہے۔ مسجد کے اندر جلنے والے چراغ جیسی

روشنیاں دنیا بھر سے منگائی گئی تھیں۔ جب یہ مسجد مکمل ہوئی شہر کے امراء نے بہت سی نادر چیزیں تحفے میں دیں جن میں ہاتھ کے لکھے ہوئے قیمتی قرآن پاک بھی تھے۔ باہر کے صحن سے اندر داخل ہونے کے لئے پانچ دروازے ہیں۔ درمیان کے بڑے دروازے میں ایک زنجیر لٹکی ہے روایت کے مطابق یہ زنجیر اس لئے لٹکائی گئی تھی کہ بادشاہ جب گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تو گھوڑے سے اتر کر مسجد کے احترام میں عام آدمی کی طرح اندر داخل ہو۔ ہم نے وہاں کوئی زنجیر نہیں دیکھی۔ ویسے بھی بادشاہ مسجد میں گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں آیا کرتے تھے۔ ان کے زوال کے بعد اس قسم کی داستانیں بنائی جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

سلطان احمد اول نے انجینئر آغا محمد سے کہا تھا کہ مسجد کے مینار سونے کے بنائے جائیں انجینئر کو غلط فہمی ہوئی اور اس نے مسجد کے چھ مینار بنا دیئے۔ بادشاہ مسجد کے مکمل ہونے کے بعد جب افتتاح کرنے آیا تو چھ مینار دیکھ کر سخت ناراض ہوا اور حکم دیا کہ مینار گرا دیئے جائیں کیونکہ خانہ کعبہ کی مسجد کے مینار چھ ہیں۔ ان دنوں پورا عرب ان کی سلطنت میں تھا اس لئے انجینئر آغا محمد نے جا کر خانہ کعبہ کی مسجد کے سات مینار بنا دیئے۔ ترکی اور دنیا بھر میں یہ پہلی مسجد ہے جس کے چھ مینار ہیں۔ اپنے حسن اور تعمیراتی انداز میں منفرد ہے۔ ترکی میں جس مسجد کے مینار ایک سے زیادہ ہوں وہ بادشاہوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ عوام صرف ایک مینار کی بناتے ہیں۔ اس کی وجہ عثمانی خلیفہ کا حکم اور زیادہ قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ معاشی مسائل ہوں گے، مسجد کے فرش پر بچھا ہوا قالین اعلیٰ درجے کا ہے کیونکہ اس پر نماز پڑھی جاتی ہے۔

اسے نیلی مسجد کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اندر ٹائل کا کام اور شیشے نیلے رنگ کے ہیں جن سے اندر کا حسن اور بڑھ جاتا ہے اس میں 260 کھڑکیاں ہیں۔

مسجد کے سامنے کچھ مقبرے بنے ہیں جن میں سلطان احمد ان کے صاحبزادے عثمان دوئم اور مراد چہارم۔ دفن ہیں۔ یہ حصہ سیاحوں کو دکھانے کا نہیں ہے۔...

ہم مسجد دوپہر سے ذرا پہلے پہنچے۔ سامنے دو طرف دکانیں تھیں۔ کوچ پارک کر کے باہر ایک بڑا دالان تھا جس میں گھاس لگی تھی، یہاں دسیوں فوٹو اور کتابیں بیچنے والوں نے حملہ کر دیا جو بازار سے آدھی قیمت میں فروخت کر رہے تھے یہ عجیب بات تھی۔ بہت سے سیاح خریدنے لگے۔ مسجد کے باہر بھی عیسائی مذہب کے آثار دکھائے گئے۔ مراد نے قبل مسیح کے پتھر اور

دیواریں دکھائیں۔ اس عرصے میں کتابیں فوٹو بیچنے والے تنگ کرتے رہے اور مراد انہیں ترکی میں ڈانٹتا رہا۔ اس کے بعد بڑے بڑے خیمے نظر آئے۔ جو شام کو روزہ افطار کرنے کے لئے مقامی میونسپلٹی نے لگائے تھے اس کے بعد مسجد کا وہ فرش۔ جس کی اینٹیں بے توجہی کی شکایت کر رہی تھیں۔ اس جگہ نماز عید بقرعید پر ہوتی ہے جب لوگ زیادہ تعداد میں ہو جاتے ہیں یہاں وضو کرنے کا انتظام تھا۔ اس کے بعد سیڑھیاں اور جوتے رکھنے کی جگہ، یہاں بہت سے پلاسٹک بیگ رکھے تھے۔ ہر ایک نے اپنے جوتے اس میں رکھ لئے۔ مسجد میں ظہر کی نماز ہو رہی تھی۔ اس لئے مراد پچھلی طرف سے لے گیا۔ بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر ایک دروازے سے داخل ہوئے۔ اس عرصے میں نماز ہو چکی۔ باہر سے مسجد کا تاثر اچھا نہیں۔ یہ انتظامیہ کی سرد مہری کی فریاد کر رہی تھی۔ اندر بہت بڑا گول ہال ہے۔ اسے دیکھ کر اللہ کی بڑائی اور عثمانیہ خلفاء کی اسلام سے محبت محسوس ہوتی ہے۔ ہال میں جگہ جگہ چراغ نما بلب ایک گول دائرے میں چھت سے نیچے آویزاں ہیں جس طرح مسجد قرطبہ میں ہیں۔ سامنے قبلہ کی جگہ تھی۔ کچھ لوگ ابھی تک نماز پڑھ رہے تھے۔

پشت پر گیلریاں تھیں۔ جہاں خواتین نماز پڑھ سکتی تھیں اور مذہبی میٹنگ ہوتی ہے۔

مراد نے بتایا۔ عثمانیہ خلفاء میں سلطان احمد اول چودھواں خلیفہ تھا یہ 14 سال کا تھا تو تخت پر بیٹھا۔ اسے ٹی بی تھی۔ اس کے باوجود مسجد میں خود کام کرتا تھا۔ یہ سنتِ نبویؐ ہے۔ قرطبہ کی مسجد میں عبدالرحمان الداخل بھی مزدوروں کی طرح کام کرتا تھا۔ سلطان احمد اول نے 14 سال حکومت کی اور پھر مر گیا۔ اس کی زندگی میں 14 کا ہندسہ ایک اہم کردار ادا کر گیا۔ اسے مذہب سے بے حد محبت تھی۔

ہم نے پوچھا......''اس مسجد میں کتنے لوگ نماز پڑھ سکتے ہیں ....''

مراد نے بتایا.... ''چار ہزار''

ہم اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ مسجد کے اندر اس سے زیادہ لوگ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مراد سیکولر حکومت کی حمایت میں تھا اس لئے وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ کتنے لوگ یہاں اپنے رب کے سامنے سر جھکا سکتے ہیں۔

سیاح تصویریں بنا رہے تھے۔ فرش پر اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ سیاحوں کی ٹولیاں اپنے

گائیڈ کے ساتھ اس مسجد کے بارے میں معلومات حاصل کر کے حیران ہو رہے تھے۔

باہر نکلے تو ایک جگہ مسجد کی دیکھ بھال کے لئے چندہ لیا جا رہا تھا۔ ہم نے چندہ دیا لیکن اس بات کو پسند نہیں کیا۔ مسجد کی تعمیر اور تزئین حکومت کا کام ہوتا ہے۔ سیاحوں سے مانگنا نہیں چاہئے۔ یہ نامناسب بات ہے۔

....

سینٹ صوفیہ

بلو مسجد کے نزدیک..... سینٹ صوفیہ چرچ ہے۔ اس کے قریب ٹرکش اسلامی آرٹ اور موزیک میوزیم واقع ہے۔

ہم صوفیہ چرچ دیکھنے جا رہے تھے..... یہ بے حد پرانا اور فن تعمیر میں ایک نادر نمونہ ہے۔ موسموں اور حاکموں کی سختیاں سہنے کے باوجود..... یہ ایک ہزار سال پرانی تعمیر کا شاہکار ہے اور اس وقت تک چرچ رہا جب تک مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح نہیں کر لیا۔ یہ عمارت 537 سال چرچ اور 481 سال مسجد رہی۔ اتاترک نے ترکی کو جمہوریہ قرار دیا تو 1834ء میں اسے میوزیم بنا دیا گیا۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کی تصویروں پر رنگ کر دیا تھا۔ انہیں دوبارہ صاف کیا جا رہا ہے۔ ہمارے سامنے بھی کام ہو رہا تھا۔ اندر سے تصویریں نکالی جا رہی ہیں۔ اس میوزیم کا ٹکٹ ہے۔ مراد نے خریدا اور الی شا کو دیا کہ وہ ہر ایک کو گیٹ پر جانے سے پہلے دے..... ایک بڑے

ستون کے پاس سب لوگ جمع ہو گئے۔ مراد طرزِ تعمیر کی خوبیاں گنوا کر متاثر کرتا رہا۔ آج سے ہزار سال پہلے لوگوں کو کام ہی کیا تھا۔ جس طرف لگ گئے تن من دھن لگا دیا۔ موٹے ستون اور اُونچی عمارتیں تعمیر کر دیں۔ پھر اندر گئے۔ ایک کوریڈور میں آج سے ہزار سال پہلے کی تصویریں دکھائی گئیں۔ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے مختلف مناظر تھے۔ ان تصویروں میں خوبصورت رنگ استعمال کیے گئے تھے۔ مراد کا خیال تھا مسلمانوں نے نماز کی ادائیگی کے لئے ان تصویروں پر رنگ کر کے دراصل انہیں زمانے کے گرم و سرد سے محفوظ کر دیا تھا اور اب یہ تر و تازہ ہو کر نکل رہے ہیں یہ چرچ عیسائیوں کے خدا کے تین اصولوں پر تعمیر ہوا ہے۔ آسمانی عقل، آسمانی امن وسکون اور آسمانی طاقت۔

جب یہ چرچ مکمل ہوا تو سب سے بڑی عبادت گاہ تھی۔ ایک عرصہ گزرا کہ اس میں آگ بھڑک اٹھی اور چرچ مکمل طور پر جل کر تباہ ہو گیا۔ لیکن چھ سال کی محنت کے بعد دوبارہ تعمیر ہوا۔ اس مرتبہ لکڑی سے زیادہ اینٹ پتھر اور چونے سے کام لیا گیا۔ جو ہمارے سامنے تھا اور مراد اس کی تفصیل سمجھا رہا تھا۔ یہ تعمیر ایک شہنشاہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس قسم کے کام صرف بادشاہ ہی کر سکتے ہیں۔ عام آدمی کے پاس نہ اتنا سرمایہ ہوتا ہے نہ وقت۔ اسے روزگار کمانے سے فرصت نہیں ملتی۔ شاہوں کے شوق عجیب ہوتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کے ملکوں پر حملہ کرنا۔ تیری میری عورتوں کو حرم میں ڈالنا اور فرصت کے زمانے میں عمارتیں بنوانا۔ اس سے بہت فائدے ہوئے۔ عمارتیں دیکھنے کو ملیں۔ بے کار نوجوانوں کو گائیڈ کی ملازمت ملیں اور ملک کو پرانے ٹوٹے کھنڈر دکھا کر سیاحوں سے زرمبادلہ ملا۔ ترکی میں ہمیں ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں چڑھنے اترنے کا موقع۔

اس چرچ پر ایک بار پھر آفت آئی۔ بادشاہ کے خلاف بغاوت کامیاب ہوئی اور چرچ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ لیکن جلد ہی باغیوں کا سر کچل دیا گیا اور جو نیا بادشاہ تخت نشین ہوا اس نے دوبارہ سے چرچ بنانا شروع کیا۔ بہترین تعمیر کرائی جو ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ اسے 5 سال تک 10 ہزار مزدوروں نے دن رات محنت کر کے بنایا تا کہ ہم ترکی آ کر اسے ملاحظہ کر سکیں۔ مراد نے اس کی جو تفصیل بیان کیں۔ وہ کسی انجینئر کے لئے زیادہ مناسب تھیں۔ اس کے گنبدوں کی لمبائی چوڑائی، ستونوں کا وزن، تصویروں کی تازگی۔ ہمیں تو سب تصویریں

ایک سی لگتی ہیں۔

سلطان محمد ثانی نے استنبول کو فتح کیا تو عیسائیوں کو مکمل پناہ دی گئی ان کے جان و مال کو تحفظ دیا گیا۔ انہیں اپنے مذہب پر کار بند رہنے کی اجازت دی گئی۔ سلطان گھوڑے پر سوار صوفیہ چرچ میں گیا اور وہاں لوگوں کو امان دی اور اسے مسجد بنا دیا۔

اندر داخل ہوئے تو ایک عظیم الشان گول ہال تھا اوپر گنبد اور نیچے نماز پڑھنے کی جگہ۔ سیدھے ہاتھ پر ایک بہت بڑی پلیٹ پر اللہ کا نام لکھا ہے۔ الٹے ہاتھ پر محمدؐ اور سائیڈ کی دیوار پر چاروں خلفاء کے نام درج ہیں۔ داخلے کے دروازے کے دونوں طرف رسالت مآب صلعم کے نواسوں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے نام لکھے ہیں۔ یہ بڑی پلیٹیں خطاطی کے اعلیٰ نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک طرف گیلری تھی جہاں ہر وقت قرآن کی تلاوت ہوتی رہتی تھی۔

اس چرچ میں قبلہ رخ کرنے کے لئے نماز میں صفیں ذرا سی ترچھی بنائی جاتی تھیں۔ اوپر گیلریاں تھیں جن میں خواتین کی نماز کا انتظام تھا۔ اب عیسائی تصویروں کی نمائش ہوتی ہے۔ صالح شیخ نے سنا تو فوراً گیلری کی طرف روانہ ہو گیا۔

مسجد میں اُس وقت بھی کام ہو رہا تھا۔ مسلمانوں نے جن تصویروں پر رنگ پھیر دیا تھا۔ وہ بڑی حفاظت سے صاف کیا جا رہا تھا۔ تا کہ حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور بادشاہوں کی تصویریں نکالی جائیں اور استنبول والے اس میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

ہو سکتا ہے جب ہم دو چار سال بعد دوبارہ استنبول جائیں تو وہ پلیٹ بھی نظر نہ آئیں جن پر اللہ اور محمدؐ کا نام درج ہے۔ ترکی ایک سیکولر ملک ہے۔

مسجد کا منبر رکھا تھا۔ دیوار پر آیات لکھی تھیں۔ لیکن اب یہاں نماز نہیں ہوتی۔ ترکی کو جمہوریت کا درجہ دینے والے اتاترک نے اسے میوزیم بنا دیا ہے۔

ہم نے اسپین میں مسجد قرطبہ دیکھی ہے۔ اس میں داخلے کا ٹکٹ ہے۔ اس عظیم الشان مسجد میں منبر موجود ہے۔ دیواروں پر قرآنی آیات لکھی ہیں۔ ستون اسی طرح ہیں چھت پر اسلامی طرزِ تعمیر تازہ ہے۔ چھت سے لٹکتے روشنی کے لئے چراغ اُسی طرح ہیں، مسلمانوں کے زوال کو پانچ سو سال سے زیادہ گزرے۔ لیکن مسجد میں کچھ نہیں بدلا۔ اگر آج کوئی بلال حبشیؓ اذان دے تو انسان نہیں تو فرشتے ضرور نماز پڑھنے آسمان سے اتر آئیں گے۔ اس مسجد کا فرش

شکست ہے۔ دنیا بھر کے سیاح اپنے جوتوں سمیت ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہیں۔ جہاں کبھی سجدے ہوتے تھے وہاں جوتے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اسپین میں عیسائی حکومت ہے۔ جو مسلمانوں سے نفرت کرتی ہے۔

سینٹ صوفیہ مسجد تھی۔ 481 سال اس کے میناروں سے اللہ کی کبریائی کا اعلان ہوتا رہا۔ شہسواروں، غازیوں، اپنے رب سے ٹوٹ کر محبت کرنے والوں نے اپنی پیشانیاں اس فرش پر رکھی تھیں یہ زمین سجدہ گاہ ہے۔ آج یہاں دنیا بھر کے سیاح اپنے جوتوں کے ساتھ اس فرش پر اِدھر سے اُدھر گھومتے ہیں۔

ترکی میں صدیوں سے اسلامی حکومت ہے۔ یہاں 99 فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ مسجدیں اس ملک میں ہیں۔ نمازی ہیں لیکن اتاترک نے ترکی کو جمہوریہ بنایا تو لامذہب حکومت کا اعلان کیا اور 1934ء میں اس مسجد کو گرجا بنا دیا۔

ہم تو مسجد قرطبہ کو گرجا بنانے پر احتجاج کرتے تھے۔ سینٹ صوفیہ کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

اُوپر گیلریوں میں بھی تصویریں تھیں۔ مراد نے 15 منٹ کا وقت دیا جو چاہے اِدھر دیکھ آئے اور باہر ملنے کا اشارہ کر کے چلا گیا۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ملک ملک کے سیاحوں کو جو مسلمانوں کے چرچ پر قبضہ پر افسوس کر رہے تھے۔ ان تصویروں کو دیکھ رہے تھے۔ جو آہستہ آہستہ جمہوریہ ترکی کی وجہ سے ابھر رہی تھیں۔

باہر نکلنے کے چوڑے راستے کے دائیں طرف کتابوں کی دکان تھی۔ جہاں ایک چینا مینا چرچ سے متعلق چیزیں فروخت کر رہی تھیں۔ ہمارے مطلب کی کچھ نہ تھی کچھ دیر چینا اور دکان میں آنے والے لوگوں کو دیکھتے رہے۔ پھر باہر نکلے، مراد دھوپ میں کھڑا تھا اس نے دیوار کی طرف اشارہ کیا جہاں حدیث نبویؐ درج تھی۔

"جو قسطنطنیہ فتح کرے گا میں اسے جنت کی بشارت دیتا ہوں۔"

اس پلیٹ پر ابھی شاید کسی کی نظر نہیں پڑی اسکے نیچے بھی کوئی پرانی تصویر نہ بنی ہو۔

....

بکلا وامل گیا

ہمارا ہوٹل کاروان سرائے شہر کے بیچوں بیچ تھا۔ ذرا دور لیکسن اسکوائر تھا جہاں کھانے پینے اوڑھنے بچھونے کا ہر سامان ملتا تھا۔ ہوٹل میں شام کے کھانے کا انتظام تھا بلکہ یوں کہیں روزے کے افطار کا اہتمام تھا۔ لیکن سیاح اِدھر اُدھر گھومنے آیا ہے۔ اس لئے ہم اور ای ڈی پیدل سیر کو نکل گئے۔ سیدھے چلتے رہے تو ایک لوگوں سے بھرا مصروف اسکوائر آ گیا۔ سامنے میکڈونلڈ تھا۔ بینک تھے۔ ٹیلی فون بوتھ لائن سے تھے۔ پوسٹ آفس نزدیک تھا۔

ای۔ ڈی کا خیال تھا۔ حاجی بابا کے ہوٹل جانا چاہئے۔ ہمارا کہنا تھا میکڈونلڈ آزمایا ہوا ہے۔ نئے کھانے کا رسک اپنے ڈالر سے نہیں لینا چاہئے۔

سڑک پار کرنے کے لئے سگنل کھلتا تو سینکڑوں لڑکے اور لڑکیاں سڑک پار کرتے۔ اس دن ہمیں اندازہ ہوا کہ ترکی میں نوجوانوں کی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ حیرت انگیز

بات ہے یہ سب ہی اسمارٹ ہیں، اور نہایت پھرتی سے سڑک پار کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر تو تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر ایک ریلے میں ہم بھی دوسری طرف تھے۔ سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ہم ڈر گئے۔ یہ بم بلاسٹ کہاں ہوا ہے۔ خدا خیر کرے۔ لیکن ٹریفک اور لوگ اطمینان سے مصروف تھے۔ تب معلوم ہوا یہ روزہ کھولنے کے لئے توپ داغی گئی ہے۔ پرانے زمانے کی یاد تازہ ہوگئی۔ ترکی میں مسلمانوں کی تعداد 99 فیصد ہے۔

میکڈونلڈ کی دکان پر رش تھا۔ ایک لائن میں لگ کر برگر کا آرڈر دیا۔

''یہ حلال ہے نا... ''ہم نے کاؤنٹر پر پوچھا۔

کاؤنٹر والی نے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ ہمیں خیال آیا۔ ترکی میں یہ سوال ضائع ہوا۔ اسلامی ملک ہے ہر جانور ذبح کیا جاتا ہے۔

ملک میں سؤر نہیں کاٹا جاتا۔

لیرا میں ادائیگی تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کتنے لاکھ میں خریدا ہے اسی خوف سے سب سے چھوٹا کولڈ ڈرنک خریدا اور پہلی بار انتہائی اطمینان اور سکون سے لطف لے کر کھایا۔ سخت باتھ روم استعمال کیا۔ باہر نکل کر ایک دکان سے پوچھا'' بکلاوا کہاں ملے گا۔''

اس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ وہ سڑک کے دوسری طرف تھا۔ وہاں تک کیسے پہنچیں۔ دو تین جگہ سے خلقت ترکی کے ساتھ سڑک پار کی اور اس طرف پہنچے تو سبزی کی دکان، سگریٹ فروش اور چائے کا کھوکھا۔

ای۔ ڈی کا کہنا تھا۔''کسی بیکری سے دریافت کریں۔''

بیکری مل گئی تو اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ وہ غریب اپنی دکان میں تیار ہونے والی ہر چیز دکھا رہا تھا۔ لیکن بکلاوا سے واقف نہیں تھا ہم سمجھ گئے۔ اس نام کی کوئی مٹھائی نہیں ہوتی۔ خیر بازار کی دکانیں دیکھنے میں کیا حرج تھا۔

ایک جگہ کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ہم نے دیکھا تو ایک ننھی منی بچی گٹار بجا رہی تھی۔ وہ اتنی پیاری بچی تھی کہ ایک ہی نظر میں دل میں گھر کر رہی تھی۔

اتنی چھوٹی عمر میں اس مہارت سے گٹار بجا رہی تھی کہ ادھر سے گزرنے والے ہر شخص کے قدم رک جاتے تھے۔ اللہ نے کیا شکل بنائی تھی۔ کیا نقش تھے۔ آنکھیں پلکیں ہونٹ، ہم

قدرت کا شاہکار دیکھ رہے تھے کہ ایک راہ گیر نے اسے نوٹ دیا۔ اس نے لے لیا۔ تب احساس ہوا۔ یہ بچی گٹار بجا کر لیرا اکٹھے کر رہی تھی۔ ہم نے فوراً ایک نوٹ نکالا اور اسے دیا۔ امداد کے طور پر نہیں۔ اس کے گٹار بجانے پر۔

اچانک بچی نے گٹار بجانا بند کر دیا۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا ای ڈی غائب تھا، سامنے ایک بڑی دکان مٹھائی کی نظر آئی۔ یہی منزل مراد محسوس ہوتی تھی۔ ہم لپک کر بڑھے اندر جا کر پوچھا،

''بکلاوا''

دکاندار نے ترکی میں کچھ کہا اور سر ہلایا۔ ...

''دکھاؤ.....''

اس نے ایک کاغذ پر چھوٹے سموسے کی طرح کی مٹھائی رکھ دی اور اشارے سے کہا ''کھاؤ''

ہم نے ذرا سی چکھی تو احساس ہوا یہ مکمل شہد لیکن ذائقے میں بہترین۔

''آپ ہندوستانی ہیں.....'' دکاندار نے پوچھا۔

''نہیں۔ پاکستانی.....''

''اوہ بھائی..... کتنا دوں۔''

''ایک کلو... قیمت کیا ہے۔''

''50 لاکھ لیرا... ''اس نے بتایا۔

''کچھ رعایت.....''

''اس کی گنجائش نہیں.....''

''بھائی کو تجارت میں بھی رعایت نہیں ملتی.....''

بہرحال ہماری مطلوبہ مٹھائی استنبول میں مل گئی۔ اس کی خوشی تھی۔ اس وقت ای ڈی غائب تھا۔ ہم سمجھ گئے جب تک ہمارے ساتھ ای ڈی رہا بکلاوا نہ ملا۔

یہ معلوم ہوتا تو ای ڈی کو ساتھ نہ رکھتے۔

....

توپ والے محل کا دورہ

استنبول میں صبح سے رک رک کر پھوار پڑ رہی تھی۔ ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ ایک پتلی سڑک پر دونوں طرف دکانوں کے درمیان کوچ رک گئی۔ انواع و اقسام کی اشیاء فروخت کے لئے رکھی تھیں۔ ایک خاص چیز تھی۔ شربت، ترکی زبان میں بھی لفظ شربت استعمال کیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء خریدنے والوں کی تعداد کم تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔

کوچ سے اترے تو نوجوان لڑکوں نے کتابیں اور تصویریں فروخت کرنے کے لئے حملہ کر دیا۔ مراد ان سے بچا کر ایک بڑے گیٹ میں داخل ہوا۔ پکی سڑک دونوں طرف ہوا میں لہراتے پتوں والے درخت، بعض کوچ یہاں تک آ رہی تھیں لیکن مراد چاہتا تھا ہم سرد موسم کا لطف اٹھائیں۔ ہمارا رخ اس دروازے کی طرف تھا جو عثمانی خلیفہ کے محل کے مرکزی دروازے تک لے جا رہا تھا۔ اسے توپوں والا دروازہ کہتے ہیں۔ بادشاہوں کے زمانے میں یہ صبح کی اذان

کے وقت کھلتا اور عشاء کی نماز کے بعد بند کر دیا جاتا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے۔ بڑے گیٹ پر پہنچے وہاں کھڑکی تھی۔ محل دیکھنے کے لئے ٹکٹ تھا۔ مراد نے خریدے اور ہر ایک کو دیئے۔ مرکزی دروازے میں کیمرہ اور خواتین کے پرس اسکیننگ مشین پر رکھے گئے۔ جب سامان کلیئر ہوا تو سب جمع ہو گئے۔ سامنے لکڑی کے اسٹینڈ پر محل کا ماڈل رکھا تھا۔ مراد سمجھانے لگا۔ یہ محل ''توپ کاپی'' کہلاتا ہے۔ اصل نام ''سرائے سیڈی ڈیڈا میر'' تھا۔ یعنی امیروں کی سرائے۔ ہمیں یہ نام پسند آیا۔ دنیا سرائے ہے کوئی آتا ہے دوسرا جاتا ہے۔ شاہوں کے محل تو خاص طور پر سرائے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی موت کا ہاتھ۔ یا بغاوت کی کامیابی ہارنے والے کی سرائے بنا دیتا ہے...... محل کے باہر بہت سی توپیں لگی تھیں عوام نے ''توپ کاپی'' یا ''توپ والا محل'' کہنا شروع کر دیا۔ اب یہ اس نام سے مشہور ہے۔

یہ توپ والا محل 400 سال پرانا ہے۔ جو دنیا کے عظیم بادشاہوں کی رہائش گاہ رہا ہے استنبول کی تاریخی اور اہم جگہ۔ یورپ میں سب سے زیادہ سیاح یہاں آتے ہیں ہر سال 25 لاکھ افراد اس کا دیدار کرتے ہیں۔ آج ہم ان میں شامل تھے۔ مراد بادشاہوں کی تعریف وہی کر رہا تھا۔ جو اکثر جمہوری حکومت کے بعد ہوتی ہے..... سو سال پہلے اگر مراد اس قسم کا ایک جملہ بھی بولتا تو سر کاندھے پر نہ پاتا لیکن اب جو چاہے ان کے بارے میں زبان درازی کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ وقت بدل چکا ہے۔

1453ء میں ترک بادشاہ سلطان محمد نے استنبول فتح کیا تو اس محل کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ تین سال میں مکمل ہوا۔ اس کا ڈھانچہ لکڑی کا بنا تھا اس لئے کئی بار آگ سے برباد ہوا۔ زلزلوں نے بھی نقصان پہنچایا۔ اس لئے ہر بادشاہ کے زمانے میں اس کی تعمیر تزئین و آرائش ہوتی رہی یہ محل 5 کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ خیر اس کے برابر تو ہمارا لاہور کا گورنر ہاؤس اور کراچی میں گورنر کے رہنے کا بنگلہ ہوگا۔ اس زمانے میں زمین کا کیا مسئلہ تھا۔ بادشاہ لوگوں کو روزگار مہیا کرنے کے لئے تعمیرات کرایا کرتے تھے۔ اس محل کا رقبہ سات لاکھ اسکوائر میٹر ہے جو روم کے ویٹیکن سٹی سے دوگنا ہے۔ اس سے عیسائی حضرات کو محل کی عظمت بتانی مقصود نہیں صرف حساب کتاب سمجھانے کے لئے ہے۔ جو بادشاہ آدھی دنیا پر حکومت کرتے تھے۔ ان کے محل کم از کم اتنے بڑے تو ہونے چاہیے تھے۔

گیٹ کی سیکورٹی سے نکل کر گھاس کے لان اور پھولوں کے درختوں کے درمیان سے چل کر دائیں طرف آئے۔ ایک راستے نے دو رویہ کمروں کے درمیان پہنچا دیا۔ یہ عثمانی خلیفہ کے باورچی خانے تھے۔ یعنی پہلے طعام پھر کلام۔

شاہوں کے دربار میں کھانے پینے کے انتظامات خصوصیت سے ہوتے تھے یا اب ان کا تذکرہ نمک مرچ لگا کر کیا جاتا ہے۔ ان کمروں کے اوپر چمنیاں بنی ہیں۔ یعنی یہ کھانے پکانے کے مخصوص کمرے تھے۔ اس میں 1200 باورچی کام کرتے تھے۔ یہ بڑا حصہ ہے۔ جس میں حمام اور مسجد موجود ہے۔ باورچیوں سے کہا جاتا ہوگا۔ پہلے غسل کرو پھر وہ اچھا کھانا پکنے کی دعا کرتے ہوں گے۔ بعد میں عذاب شاہی سے بچنے کے لئے اللہ کو سجدہ کرتے ہوں گے۔ یہ دس بڑے کمرے تھے۔ جس میں مادر ملکہ، ولی عہد اور بادشاہ کے لئے کھانا تیار ہوتا تھا روزانہ 20 ہزار کھانے پکائے جاتے تھے۔ پانچ ہزار ملازمین کے لئے الگ کھانے پکائے جاتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق سالانہ 30 ہزار مرغیاں 23 ہزار بھیڑیں اور بے شمار پھل، سبزیاں، خشک میوہ جات الگ ہوتے تھے۔

بادشاہوں کو ہمیشہ اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا اس لئے شہزادوں کو بچپن سے تھوڑا تھوڑا زہر کھلایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ عادی ہو جائیں۔ جب سازشیں کامیاب ہوتی ہوں گی۔ یہ مقدار بڑھا کر زندگی کا چراغ بجھا دیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور ولی عہد کے لئے کھانے کے ایسے برتن استعمال ہوتے تھے۔ جن میں اگر زہر ملا کھانا رکھا جائے تو کھانے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر بادشاہ کا رنگ بدل جاتا تھا اور باورچی کا رنگ بدلنا ضروری ہو جاتا۔ ان دنوں سب ایک دوسرے سے ڈرتے تھے۔ بادشاہ ولی عہد سے، ولی عہد اپنے بھائیوں سے۔ بھائی اپنی بیوی سے نہ جانے کب کون کس کا سر کاٹ کر تخت نشین ہو جائے۔ ہم بادشاہ ہوتے تو اس خوف سے مر جاتے کہ سایہ بھی ہماری جان کا دشمن ہے۔ ایسی شاہی سے تو فقیری اچھی۔ خیر نہ ہم بادشاہ تھے نہ اب کوئی بنانے جا رہا ہے۔ اس لئے مراد کی بات اطمینان سے سن رہے تھے۔

باورچی کھانا پکا کر ایک لمبی سی ٹاکٹر والی جگہ رکھ دیتے اور حرم کی خواتین اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

’’راستے میں ٹھنڈا ہو جاتا ہوگا......؟‘‘ ہم نے پوچھا۔

’’حرم میں بھی باورچی خانے تھے۔ وہاں گرم کر لیا جاتا ہوگا۔ ‘‘

بادشاہ اور ان کا خاندان سوئیٹ ڈش بھی شوق سے نوش کرتے تھے۔ ان دنوں ترکی میں ’’ٹرکش ڈیلائٹ‘‘ شاہی سوئیٹ ڈش کے نام سے مشہور ہے۔ سب خریدتے ہیں ہم نے بھی کھا کر دیکھی۔ کراچی حلوے کی طرح اندر پستے بادام۔ تحفے میں یہ مٹھائی ملے تو اچھی ہے۔ تین امریکی ڈالر کا ایک پیکٹ ملتا ہے۔ یہ واحد سوویئر ہے جو ترکی سے لایا جاتا ہے۔

باورچی خانے کے سامنے ایک بڑا دو منزلہ ہال ہے جس میں شاہوں کے زمانے کے کھانے پینے کے برتن رکھے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً 12 ہزار ہے۔ اس میں مختلف ملکوں کی کراکری ہے۔ دیکھنے کی چیز۔ خاص طور سے خواتین کے لئے۔ ہمارے ساتھ نے۔ کلے اور سلینا تھیں۔ برتن دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ہر ملک کے برتن الگ۔ چین، جاپان، جرمنی، برطانیہ، وینس کے شیشے کے بنائے ہوئے برتن، استنبول میں خاص طور سے شاہوں کے استعمال کے کانٹے چمچے چھریاں پلیٹیں۔ ان پر بنے نقش و نگار۔ حسین صراحیاں۔ ان کے اوپر ڈھکن، چائے کی کیتلی، سوپ رکھنے کا برتن اس کا اسٹینڈ، پلیٹوں کے درمیان وہ حسین پھول، ڈیزائن اگر ہمیں اس میں کھانا دیا جائے تو پھول پتے اور نقش و نگار دیکھنے میں کھانا ٹھنڈا کر دیں۔ انسانی ہاتھوں کی حیران کن صناعی۔ بعض پر سونے چاندی کا کام۔ مختلف دھاتوں کے برتن، سونے چاندی کے پیالے۔ چمچے، چھریاں، کانٹے۔

نیچے کے کمرے میں برتن تھے۔ الماریوں میں ان کے نیچے تفصیل ۔ ہر ایک غور سے دیکھ رہا تھا۔ آج برتن تھے لیکن نہ وہ کھانے تھے نہ کھانے والے۔ ہال میں سیڑھیاں اوپر چڑھتی تھیں۔ پہلی منزل پر بھی حسین نازک برتن سجے تھے۔ یہ عثمانی خلفاء کے حسن ذوق کی منہ بولتی تصویر تھے۔ ہم باہر آ گئے۔ خوشگوار موسم میں بینچ پر مراد بیٹھا تھا اور لی ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔ کھانوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی شاید اسے بھوک لگی ہو۔ خواتین نے برتنوں کے میوزم سے نکلنے میں خاصی دیر لگائی۔ اس کے بعد بھی اسی موضوع پر گفتگو کرتی رہیں۔

باورچی خانے کا حصہ بند تھا۔ شاید مرمت جاری تھی ویسے بھی چولہے اور چمنیاں دیکھنے کا کیا فائدہ۔ جب مزیدار لذیذ کھانے پکانے والے نہیں ان کے خوش ذائقہ کھانے نہیں تو در و دیوار کو دیکھنے سے کیا حاصل۔

باورچی خانے کے بعد ایک باغ سے گزر کر دیوان خاص کے دروازے پر پہنچے جہاں ایک چھت کے نیچے خلیفہ خاص خاص موقعوں پر بیٹھتے تھے تخت نشینی اسی جگہ ہوتی جب شاید ہی فوجوں کو کسی علاقے کو فتح کرنے کے لئے بھیجنا ہوتا انہیں جھنڈا اسی جگہ دیا جاتا۔ عید بقرعید پر امراء سے ملاقات کرنی ہوتی۔ بادشاہ درمیان میں تخت پر بیٹھ جاتا اس کا جھنڈا پیچھے لگا دیا جاتا۔ زمین میں جھنڈا لگانے کا سوراخ آج بھی موجود ہے امراء، روساء، وزرا اور فوجی افسران نیم دائرے کی شکل میں کھڑے ہوجاتے۔ ایک ایک کرکے بادشاہ کا ہاتھ چومتے مبارکباد دیتے یا سفر کی اجازت چاہتے۔ بادشاہ اسی جگہ تحفے تحائف دیتا سامنے ایک بارہ دری تھی جہاں عام اجلاس میں وزراء اور اہم کارکنانِ حکومت بیٹھتے جہاں ہم کھڑے تھے۔ وہاں بادشاہ کا تخت رکھا ہوتا تھا اور اب ہمارے قدم تھے یہی وقت کا المیہ ہے جہاں تخت و تاج وہاں سیاحوں کے قدم ایک دروازہ پار کرکے راہ داری اور پھر چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک طویل کمرہ جس میں ایک فوارہ تھا۔ جو دوران گفتگو چلتا رہتا تھا تاکہ غیر متعلقہ لوگ گفتگو نہ سن سکیں۔ کمرے میں زرد اور ہرے رنگ کے ٹائل تھے عثمانیہ دورِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یہ ڈیزائن ترکی میں ہاتھ سے بنائے جانے والے قالینوں پر بھی ملتا ہے۔ کمرے میں سامان اسی طرح رکھا ہے۔ دیوان خاص کے باہر ایک پلیٹ پر دو طرف لکھا ہے۔ ''حضرت عبدالمجید خان المظفر دائما'' دیوان کے بائیں طرف اسکول کی عمارت ہے۔ جس میں امراء، روساء اور فوجیوں کے ذہین بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ جنہیں کل حکومت کے کام سنبھالنے تھے ... یہ تعلیم مفت تھی... ان دنوں عمارت محکمہ آثار قدیمہ کے زیر استعمال تھی۔ شاید اس عملے کو پرانی چیزوں کو سنبھال کر رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہوگی۔

محل کی حفاظت 18 میناروں سے کی جاتی تھی۔ جس میں پہریدار ہر وقت ہوشیاری سے حفاظت کرتے رہتے تھے۔ ایک طرف خلفاء کی رہائش، دوسری طرف اعلیٰ افسران درمیان میں باغ۔ ہر طرف سبزہ اور رنگین پھول۔ شاہوں کے اعلیٰ ذوق کا ثبوت تھے۔ آج بھی انہیں پھلنے پھولنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ مارچ اور اپریل میں جب بہار استنبول میں آتی ہے... اس کا آغاز شاہی باغ سے ہوتا ہے۔

مراد جب سے محل میں داخل ہوا تھا۔ بادشاہوں کی شان میں گستاخی کر رہا تھا۔ ایک طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''یہ حرم کا حصہ ہے ...''

سب مشتاق ہوئے کہ ایک نظر اندر سے دیکھ کر اس فضا میں سانس لے سکیں گے جہاں حسن و نزاکت دنیا بھر سے جمع کیا جاتا تھا۔ لیکن مراد نے یہ حسرت پوری نہ ہونے دی اور یہ کہہ کر ارمانوں پر اوس گرا دی'' ان دنوں یہ بند ہے ''

سیر و سیاحت کا مزہ آدھا رہ گیا۔ مراد ظالم نے یہ بتا کر شوق دید پر مزید تازیانے مارے۔

حرم میں 300 کمرے ہیں جہاں خلیفہ کے خاندان کے افراد رہتے تھے۔ پہلے اس کا ڈھانچہ لکڑی کا تھا۔ جس میں کئی بار آگ لگی۔ آخر پتھر سے تعمیر کرایا تو زلزلے نے نقصان پہنچایا۔ اس لئے بار بار تعمیر ہوئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ عمارت کو نیا طرز تعمیر ملتا رہا۔

حرم دیکھنے کا ٹکٹ الگ ہے۔ مراد کے لیرا بچے خلفاء کے زمانے میں یہاں داخلہ منع تھا۔ یہ دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ یہاں جو خواتین رہتی تھیں ۔۔ ان کا باقی دنیا سے رابطہ نہ تھا بس خاص خاص خادم .. انتہائی ضرورت کے وقت ڈاکٹر، اساتذہ کرام، ساز کار اندر جا سکتے تھے۔ غیر مسلموں کا داخلہ قطعاً منع تھا۔ یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ حرم میں تو نزدیکی رشتے داروں کے علاوہ کوئی نہیں آسکتا تھا۔ پھر اِدھر اُدھر کے لوگوں کے داخلے کا کیا سوال۔

سلطان کی بیگمات۔ ان کی مائیں۔ بھائی بہن۔ ولی عہد محل میں رہتے تھے۔ سلطان کی بیویاں مختلف علاقوں سے لائی جاتیں یا تحفے میں ملتیں۔ یہ دنیا کی حسین ترین خواتین ہوتیں۔ اگر یہ مسلم نہ ہوتیں تو دائرہ اسلام میں لایا جاتا۔ حرم میں آنے کے بعد یہ ایک طرح قید ہوجاتیں۔ حسین قید خانے میں رہتیں۔ ان میں سے بعض اپنی آزادی ختم ہونے کی وجہ سے وفادار نہیں ہوتی تھیں لہٰذا محلاتی سازشوں میں شامل ہوجاتیں۔ اس سے بچنے کے لئے وفادار کنیزوں پر بھروسہ کیا جاتا۔

ولی عہد کی ماں کو مادر ملکہ کا خطاب ملتا۔ اس کا مقام سب سے اعلیٰ ہوتا اس کے پاس 40 کمرے ہوتے۔ حرم میں انہی کا حکم چلتا۔ یہاں 46 باتھ روم 6 ترکش غسل خانے۔ 24 چھوٹے باورچی خانے، 2 مسجدیں، ایک سوئمنگ پول، ایک ہسپتال تھا۔ افریقہ کے کالے غلام اور کنیزیں خادمائیں ہوتی تھیں۔

یہ تفصیل سن کر سوائے آہ بھرنے کے اور کیا ہوسکتا تھا۔ ہمارا رخ خلفاء کے خزانے کی

طرف تھا۔ یہ ایک طویل عمارت تھی جو ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس عمارت میں ٹیکس اور دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والی رقم رکھی جاتی تھی۔ ملازموں کو ہر تین ماہ بعد تنخواہ دی جاتی۔ غالباً حساب کتاب سے بچنے اور زیادہ عملہ رکھنے کی پریشانی سے نجات کے لئے۔ اگر تیسری دنیا کے لوگ سہ ماہی تنخواہ دیا کریں تو زیادہ اسٹاف سے بچ سکیں گے اور عالمی بینک کے کہنے پر جو لوگوں کو نوکریوں سے نکال کر تنقید کا نشانہ بنتے ہیں اس سے بھی نجات ہوگی۔

مراد نے بتایا یہ محل اب میوزیم میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جن کمروں میں خزانہ رکھا جاتا ہے۔ وہاں آج بادشاہوں کے استعمال میں رہنے والی اشیا رکھی ہیں۔

بائیں ہاتھ کے دو کمروں میں سلاطین عثمانیہ کے اہل خانہ کے لباس کی نمائش ہے۔ لمبے اور چھوٹے لباس ایک جگہ کشمیر کا بنا سلک کا لباس۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ کشمیر کسی نہ کسی طرح ہر ملک اور خطے میں دکھائی اور سنائی دیتا ہے۔ زیورات بھی تھے پتھر کے زمانے سے کمپیوٹر کے دور تک خواتین کی کمزوری سنورنا اور اچھے نظر آنے کی کوشش رہی ہے۔ اس بناؤ سنگھار کے سامان میں قیمتی زیورات بھی شامل ہیں۔ بادشاہ تو بنوا دیتے ہیں۔ غریب سے غریب شخص تک یہ فرض انجام دیتا ہے۔

پہلے کمرے میں سلیم سوئم کا تخت رکھا ہے۔ نیم دائرے کی شکل کا۔ اس کے آگے پائیدان اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تخت و تاج سونے کا ہوتا ہے ...اس کمرے میں سونے کا خنجر بھی موجود ہے۔ جو ایران کے بادشاہ نادر شاہ کو تحفے کے طور پر بھیجا جا رہا تھا۔ راستے میں اطلاع ملی۔ نادر شاہ کا انتقال ہو گیا سلطان محمد اوّل نے خنجر واپس منگوا لیا۔ ہمیں افسوس ہوا۔ نادر شاہ اگر چند دن اور زندہ رہ جاتا تو کم از کم یہ قیمتی خنجر تو وصول کر لیتا۔ سلطان محمد اول نے تحفہ راستے سے واپس منگوا کر اچھا نہیں کیا۔ ہمیں یقین ہے اس قسم کا مشورہ اس کے مشیروں نے دیا ہوگا یہ ہمیشہ شاہِ وقت کو بھٹکاتے ہیں۔ ان دنوں کیا اچھا انتظام ہے۔ کوئی چیز آج بھیجو دوسرے دن منزل مقصود پہنچ جاتی ہے۔ کاش خلفاء عثمانی کے دور میں یہ نظام رائج ہوتا۔ آج ایران اس خنجر پر اپنا دعویٰ کر سکتا ہے۔ جیسے ہم کوہ نور ہیرے کے لئے اکثر واویلا کرتے ہیں۔

دوسرے کمرے میں جو تخت رکھا تھا اسے مصر کے گورنر ابراہیم پاشا نے سلطان مراد سوئم کو

تحفے میں بھیجا تھا۔ اس پر سونے کی پتریاں چڑھی ہیں اور بیٹھنے کی جگہ مخمل کی ہے۔

تیسرے کمرے میں انتہائی خوبصورت تخت قیمتی پتھروں اور سونے سے بنایا گیا تھا۔

ہم جب ترکی پہنچے تھے مراد سے ترکی ٹوپی کے بارے میں پوچھا۔

''ہم نے ترکی ٹوپی کسی کو پہنے نہیں دیکھا۔''

''ترکی ٹوپی ترکی میں نہیں پہنی جاتی......'' اس نے جواب دیا تھا۔

''لیکن ہمارے ملک میں تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ سرخ رنگ کی اونچی پھندنے والی ٹوپی ترکی ہے...... مراد نے ہمارا جملہ کاٹ دیا......'' یہ مراکش میں پہنی جاتی ہے ترکی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم چپ ہو رہے......

سفر کے دوران کسی کو ترکی ٹوپی پہنے نہیں دیکھا۔

تیسرے کمرے میں جہاں خوبصورت تاج رکھا تھا۔ اس کی الماریوں میں عثمانیہ دور کے کپڑے بھی تھے۔ اچانک ہماری نظر لمبے چوغے کے ساتھ سرخ اونچی پھندنے والی ٹوپی پر پڑی۔ مراد ہمارے نزدیک نہیں تھا۔ لیکن ہماری سمجھ میں آ گیا۔ ترکی ٹوپی 1923ء کے اتاترک انقلاب کی نذر ہو گئی۔ اسے بھی لامذہب حکومت نے ترکی سے رخصت کر دیا۔ ہمارے ملک میں اس کا نام رہ گیا۔ پاکستان کے شہر کراچی میں یہ ٹوپی دو شخص استعمال کرتے تھے ایک کا نام معلوم نہیں دوسرے صاحب رانا اظہر علی خان ترکی ٹوپی پہنے نظر آتے ہیں۔ یہ سرگرم طالب علم تھے۔ اس کے بعد سماجی کارکن بن گئے اور اب ان کی شناخت ترکی ٹوپی ہے۔

ہم شاہوں کے خزانے کو دیکھتے رہے اور باہر آئے تو ہاتھ خالی تھے۔ یہ جن لوگوں کے خزانے تھے وہ بھی جب ابدی سفر پر روانہ ہوئے خالی ہاتھ تھے۔ اس لئے شاعر نے کہا ہے۔

؎ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

****

رسالت مآبؐ کے تبرکات کے حضور میں

مراد نے بتایا

''اس میوزیم کے آخری حصے میں مذہبی شعبہ ہے۔ جس میں اسلامی تبرکات دیکھے جا سکتے ہیں۔ پہلے بادشاہوں کے خزانے سے شروع کریں سیدھے ہاتھ سے۔ سیاح اس طرف متوجہ ہو گئے۔''

ہم میوزیم کے ایک کمرے سے نکل رہے تھے تو صالح شیخ نے کہا۔

''عباسی ..... جلدی سے آخری کمروں کی طرف چلو۔ ابھی وہاں رش نہیں ہوگا...... ہم اطمینان سے دیکھ سکیں گے..... ''

ٹور کے دوران اس نے پہلی معقول بات . . کہی تھی۔ ہم دونوں تیزی سے آخری کمروں کی طرف بڑھے...... یہ مذہبی شعبہ ہے۔ باہر سے اس حصے کی دیواریں انتہائی خوبصورت

نیلے ٹائلوں سے بنائی ہیں دونوں طرف خلیفہ سلیم اوّل کا نام درج ہے دروازہ محراب نما ہے اس پر کلمہ طیبہ لکھا ہے۔ اس کے اندر دو حصے ہیں ایک میں رسالت مآبؐ کے استعمال میں رہنے والی اشیا اور دوسرے میں خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرامؓ کی چیزیں رکھی ہیں۔

دولت عثمانیہ کے 9 ویں خلیفہ سلیم اوّل نے جب مصر فتح کیا تو وہاں سے وہ رسالت مآبؐ اور صحابہ کرامؓ کی اشیا لے کر واپس آیا اور پھر امیر مکہ سلطان کی اطاعت کو ایک خط کے ذریعے آمادہ ہو گیا تو خلیفہ سلیم اول کو خادمین حرمین الشریفین کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ اس وقت آخری عباسی خلیفہ المتوکل قاہرہ میں شان و شوکت سے سلاطین مملوک کے زیر سایہ رہتا تھا۔ اس نے خلافت کے تمام اختیارات سلیم اوّل کو دیئے۔ کعبہ کی کنجیاں، رسالت مآبؐ کی تلوار، علم، چادر اور دیگر اشیا بطور سند خلافت اس کے حوالے کیں اور خطبے میں نام لینے کی اجازت بھی دی۔ یہ ساری اشیاء جو دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہیں۔ انہیں دولت عثمانیہ کے خلفاء نے بڑے احترام اور حفاظت سے رکھا۔ آج ہم انہی کے دیدار کو جا رہے تھے۔

اندر داخل ہوئے تو تلاوت قرآن پاک کی آواز سنائی دی۔ اس جگہ ایک مولانا ہر وقت کلام پاک پڑھتے رہتے ہیں۔ دائیں ہاتھ کے پہلے کمرے میں ایک کیبن میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے قاری نظر آئے۔

ہمارے سامنے چاندی کا ایک صندوق کھلا رکھا ہے۔ اوپر کے حصے میں ایک کاغذ پر مہر لگی ہے۔ نیچے سرخ رنگ کی مہر ہے جو رسول اللہ ان خطوں پر لگاتے تھے جو غیر ملکی سربراہان کو لکھے جاتے تھے۔ یہ مہر رسالت مآبؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور انہوں نے حضرت عمرؓ کو دی اور پھر حضرت عثمان غنیؓ کو ملی۔ لیکن ایک بار خلیفہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر چشمے میں جا گری۔ بہت تلاش کی لیکن ناکامی ہوئی۔

ڈیڑھ سو سال بعد بغداد سے ملی اور آخر میں عثمانی خلیفہ کے پاس پہنچ کر محفوظ ہوئی اس کے بعد ایک سونے کے صندوق میں جس پر قیمتی پتھر لگے ہیں رسالت مآبؐ کے دانت کا حصہ رکھا ہے جو جنگ احد میں شہید ہوا تھا۔

غزوہ احد میں مسلمانوں کو کفار مکہ پر فتح حاصل ہو رہی تھی۔ دشمن کی فوجیں بھاگ رہی تھیں۔ احد کی پہاڑی کی ایک سمت رسالت مآبؐ نے کچھ جانثاروں کو کھڑا کیا تھا اور انہیں

ہدایت تھی کہ کسی قیمت پر اس جگہ سے نہ ہٹیں جب تک رسالت مآبؐ کا حکم نہ ہو دشمن کو بھاگتا دیکھ کر پہاڑی پر تعینات جانثاروں نے اپنی جگہ چھوڑ دی ان دنوں کفار مکہ کے ساتھ خالد بن ولیدؓ تھے۔ انہوں نے پہاڑی کی اس سمت کو خالی دیکھا تو اس طرف سے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا۔ ایک وقت یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ نعوذ باللہ رسالت مآبؐ شہید ہو گئے۔ یہ سنتا تھا کہ مسلمان ہر طرف سے پہاڑی پر جمع ہو گئے۔ آپؐ اللہ کے فضل و کرم سے محفوظ تھے۔ لیکن دانت شہید ہو گیا تھا۔ اس حادثے کا علم ہوا تو کتنے ہی جانثاروں نے اپنے دانت توڑ لئے۔

اس دانت کے سامنے ہم کھڑے تھے۔ یہ چاندی کے صندوق میں بند ہے۔ اور نظر نہیں آتا لیکن تصور کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ عقیدت و احترام سے دل بھرا ہوا تھا۔

جب رسالت مآبؐ اپنے بال کٹواتے۔ صحابہ کرام انہیں زمین پر گرنے سے پہلے عقیدت سے اپنے پاس رکھ لیتے اور وہ آج بھی دنیا میں موجود ہیں ان کی زیارت بڑے نصیب کی بات ہے۔ توپ کاپی پیلس میں حضورؐ کے 60 داڑھی کے بال محفوظ ہیں ان میں سے ایک دیدار کے لئے رکھا گیا ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہے ایک روایت ہے کہ رسول اللہؐ کے بال سنہرے تھے۔

اسی شیشے کے کیس میں ایک طرف وہ خط رکھا ہے جس میں رسول اللہؐ نے شہنشاہ ہرقل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ یہ خط مصر سے ملا تھا یہ سیاہ چمڑے پر تحریر ہے۔ لمبائی 16X19 سینٹی میٹر ہے اور اس پر 12 لائنیں درج ہیں۔ خط کے برابر انگریزی ترجمہ بھی رکھا ہے۔

دائیں طرف چاندی کی ایک تخت پر رسالت مآبؐ کی چادر رکھی ہے۔ جو انہوں نے عربی کے شاعر کعب بن زہیرؓ کو دی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد یہ چادر مختلف خلفاء سے ہوتی عباسی دور میں آئی اور پھر سلیم اوّل کو دی گئی۔ جو اسے استنبول لائے اور چاندی کے تخت پر مسلمانوں کے دیدار کے لئے رکھ دی۔ یہ چادر سیاہ اون کی بنی ہوئی ہے اور 124 سینٹی میٹر لمبی ہے۔

رسول اللہؐ غزوات کے دوران سیاہ اور سفید جھنڈا استعمال کرتے تھے۔ مصر سے ایک سیاہ جھنڈا ملا لیکن شکستہ حالت میں تھا مرمت کر کے اس جگہ رکھا گیا ہے۔

رسالت مآبؐ کے پاس نو تلواریں تھیں۔ ان میں سے صرف دو موجود ہیں ایک ذوالفقار جو انہوں نے اپنے داماد حضرت علیؓ کو دی اور دوسری انہیںؐ اپنے والد کے ورثے میں ملی تھی دونوں تلواروں پر سونا چڑھا کر دستوں کو قیمتی جواہرات سے سجایا گیا ہے۔

اس جگہ سونے کے ایک صندوق میں رسالت مآبؐ کا پائے مبارک کا نشان بھی رکھا ہے یہ سیدھے پاؤں کا نشان ہے۔ دنیا میں اس قسم کے نشان چھ ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے سامنے رکھا تھا۔

اس کمرے کے بعد ہال ہے۔ ایک طرف خانہ کعبہ کے تالے اور چابیاں دیوار سے لگی ہیں۔ یہ سب سونے کے ہیں ان کی تعداد 13 ہے اور یہ مختلف سائز کی ہیں اس کے باہر حجر اسود کے گرد سونے کا گول فریم لگا ہے۔ جس کا وزن 14 کلوگرام ہے۔

یہاں چاروں خلفاء راشدین کی تلواریں رکھی ہیں۔ ان کے دستوں پر سونا لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے نمایاں فوجی کمانڈروں کی تلواریں رکھی ہیں۔ حضرت جعفر طیارؓ کی تلوار نمایاں ہے۔ خالد بن ولیدؓ کی تلوار بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ تلوار جو اسلام کے لئے اٹھی اور اللہ کی رضا سے فتح پائی۔

ایک سمت رسالت مآبؐ کے روضے کی دھول رکھی ہے۔ ہال کے بعد ایک کمرہ ہے جس میں مختلف دور کے قرآن پاک رکھے ہیں اور ایک ایسا قرآن کریم جس کے صفحات پر آج بھی خون کے ہلکے دھبے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ کلام پاک تھا جسے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ اس وقت پڑھ رہے تھے جب انہیں شہید کیا گیا اور خون اس قرآن پاک کے صفحات پر گرا۔ اس قرآن کا سائز ذرا بڑا ہے۔ یہ دو بالشت چوڑا ہے۔ ایک صفحے پر 16 اور دوسرے پر 18 لائنیں ہیں۔ ہم نے تصویر اتارنا چاہی تب منتظم نے روک دیا۔ "ہم نے دل میں تصویر کھینچ لی تھی۔ جو ہمیشہ رہے گی۔ یہاں تھوڑی دیر ٹھہر سکے۔

ایسا محسوس ہوتا تھا۔ اس جگہ کے لئے ہم کب سے تڑپ رہے تھے۔ کالی کملی والے کی کملی دیکھ لی۔ موئے مبارک کا دیدار ہوا۔ انؐ کے روزے کی خاک دکھائی دی۔ یوں محسوس ہوا ہم اسی دور میں ہیں۔ چاروں طرف صحابہ کرامؓ کی تلواریں ہیں اور کفر مٹ چکا ہے۔ تب ہمارے دل میں ایک ہی دعا آئی۔

"اے میرے رب ترکی کی حکومت کو سیدھا راستہ دکھا۔ جس پر تیری نعمتیں نازل ہوئی ہیں اور اس راستے سے بچا جس پر تیرا قہر نازل ہوا ہے......"

بے شک تو بڑی دعائیں سننے والا ہے۔

....

کورڈ بازار کی سیر

دنیا کے تمام گائیڈ، سیاحوں کو دوکانوں کی طرف دھکا دیتے ہیں ان میں خواتین شامل ہوں تو موقع بے موقع اشیاء پر خود گرتی رہتی ہیں ہر ملک کی عورتوں کی توانائی کا راز اور صحت کا ٹانک شاپنگ ہوتا ہے۔ ہمیں تعجب تھا کہ مراد خریداری کے لئے زیادہ زور نہیں دے رہا کیا اس کا دل گائیڈ کے پیشے سے بھر گیا۔ یا ملک سے ہجرت کر رہا ہے۔ لیکن استنبول کے قیام کے آخری دنوں میں اس کا جذبہ گائیڈ ابھر آیا۔ پہلے تو وہ "مرچ مصالحے والے بازار" کی تعریفیں کرنے لگا۔ اس پر خواتین کے کان تو کھڑے ہوئے لیکن مرد حضرات نے توجہ نہیں دی۔ اب بھلا سیر و سیاحت کے دوران مرچ مصالحے والے بازار جانے یا خریداری کا کیا موقع بنتا ہے۔

یہ پی لوگ "مرچ مصالحہ" کب استعمال کرتے ہیں۔ زبان کے چٹخارے تو ہمارا معاملہ ہے مراد کے دامن میں ابھی اور چنگاریاں چھپی تھیں۔ اس نے "کورڈ مارکیٹ" یعنی ڈھکے

ہوئے بازار کا ذکر چھیڑ دیا۔ ترکی کے سوونیئر اور انواع و اقسام کی چیزوں کا وہ نقشہ کھینچا کہ ہم بھی آنکھیں جھپکانے لگے۔

یہ بازار کئی سو سال پرانا ہے۔ اسے بارہ مرتبہ زلزلوں اور 9 بار خطرناک آگ نے برباد کیا ہے اور ہر بار پہلے سے بہتر بنا۔ اس میں تین ہزار پانچ سو دکانیں، پندرہ ہزار تاجر، 80 سڑکیں اور گلیاں ہیں۔ بازار کے 18 گیٹ ہیں سب سے اہم گیٹ پر کتابیں، جھنڈے، ہتھیار فروخت ہوتے ہیں۔ اس گیٹ پر خلیفہ عبدالمجید دوئم نے لکھوایا ہے۔

''اللہ تاجروں سے محبت کرتا ہے....''

بازار کے اندر سات فوارے، ایک بڑی اور بارہ چھوٹی مسجدیں ہیں۔ اسکول، غسلخانے، خلیفہ عثمانیہ کے زمانے میں یہاں بینک اور زرمبادلہ کے ادارے بھی تھے۔ دنیا بھر کے مسالے اور لکڑی بھی فروخت ہوتی ہے۔ کچھ عرصے یہ غلاموں کی مارکیٹ بھی رہی۔ روس میں جب انقلاب ہوا تو لوگ وہاں کے نوادرات لے کر آئے اور اسی مارکیٹ میں فروخت ہو گئے۔ اب بھی دنیا بھر کی نادر اشیاء یہاں فروخت ہوتی ہیں۔ کم از کم ترکی میں بنائی جانے والی ہر چیز ملتی ہے دکاندار خوش اخلاق اور انگریزی بولنے والے ہیں۔ اس بات پر ہمیں تعجب ہے۔ اگر دکاندار گاہکوں سے اچھی طرح پیش نہیں آئے گا۔ لڑے جھگڑے گا تو اس کی اشیاء کون خریدے گا۔ اس بازار کے بارے میں مشہور ہے جو یہاں نہیں آیا سمجھیں وہ استنبول نہیں آیا۔ اسی طرح لاہور والے بھی کہتے ہیں۔ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ خدا کا شکر ہے ہم نے لاہور ان دنوں دیکھا جب چاند چھونے اور پھول پینے کے دن ہوتے ہیں اور استنبول باہوش و حواس آئے تھے۔

سیاح کورڈ بازار جانے کا سوچ رہے تھے۔ مراد نے خوش خبری سنائی۔ ''آج دوپہر اس سمت جانے کا پروگرام ہے......'' کوچ میں اظہار خوشی کے لئے تالیاں بجائی گئیں سوائے ای ڈی کے وہ پانچ ہزار ڈالر کا قالین لے کر بے چین تھا۔

کوچ استنبول کے اونچے نیچے بازاروں گلیوں کوچوں سے نکل کر ایک پارکنگ لاٹ میں پہنچی۔ وہاں پہلے ہی کئی کوچ پارک تھیں۔ اس کا مطلب تھا اور لوگ بھی آئے ہیں۔ اس جگہ آنا ترکی کی سیاحت میں ضروری تھا۔

مراد نے بتایا...... اسی جگہ سے ایک گھنٹے بعد واپسی کا سفر ہوگا۔'' .... سیاح کوچ سے اتر آئے تو مراد کے ساتھ بازار کی طرف چل پڑے۔

یہ شہر کا اندرونی علاقہ ہے...... گلیاں تنگ اور دونوں طرف دکانیں ہیں۔ روزمرہ کی اشیاء فروخت ہو رہی ہیں۔ لیکن گاہک نظر نہیں آتے۔ کورڈ مارکیٹ نزدیک ہی ہے لوگ اس میں چلے جاتے ہوں گے۔ استنبول کی خصوصیت اونچے نیچے راستے ہیں۔ ایک تنگ گلی نیچے جانے لگی۔ سب اس پر چل پڑے۔

دائیں طرف ایک عظیم الشان مسجد سر اٹھائے کھڑی ہے۔ لوگ نماز پڑھ کر باہر آ رہے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں...... ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی۔ یہ مسجد چار سو سال پرانی ہے۔ خلیفہ مراد سوئم نے تعمیر کرائی تھی۔ حکومت دیکھ بھال کرتی ہے۔ باہر سے اس کی حالت خراب ہے۔ ترکی کی دیگر مسجدوں کی طرح۔

مسجد کے آگے تنگ سڑک ہے...... سامنے بڑا دروازہ۔ یہی سب سے بڑا گیٹ ہے جو کورڈ مارکیٹ کا راستہ ہے...... مراد سب کو یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر چھت سے ڈھکا ہوا بازار ہے...... دونوں طرف دکانیں جگمگا رہی تھیں اور دکاندار......

گاہکوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ بعض نے آوازیں بھی لگائیں۔ مراد نے کہا تھا یہ دکاندار فوراً رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ اس لئے ہماری ساتھی خواتین کو ''بہن'' اور ہمیں ''بھائی'' کے خطاب سے بلایا گیا دکانوں میں سجاوٹ، کھانے پینے اور گھریلو استعمال کی چیزیں فروخت کے لئے رکھی تھیں۔

ترکی میں نیلے رنگ کی آنکھ، گھروں، دفتروں اور گاڑیوں میں لگاتے ہیں تاکہ بری نظر سے بچ سکیں۔ اس مارکیٹ میں یہ ہر نمونے اور ڈیزائن کی ڈھیروں تھیں۔ ٹرکش ڈیلائٹ، پستے بادام اور اخروٹ کی مٹھائیاں، چینی کے برتن، شیشے کی سجاوٹی اشیاء...

پہلے ہم سب ساتھ چلتے رہے۔ پھر دو دو کر کے دکانوں پر رکتے رہے آخر میں کلے ای ڈی اور ہم رہ گئے۔ ان دکانوں کے درمیان سے گلیاں بھی نکلتی تھیں۔ جو آگے بڑھ جاتی تھیں۔ ہم تینوں ایک گلی میں مڑے تو قالینوں کی دکانیں نظر آئیں۔ ای ڈی اپنی معلومات بڑھانے ایک دکان پر قیمت پوچھنے لگا۔ دکاندار چمٹ گیا۔ جان بچانی مشکل ہو گئی۔

کلے کو ٹرکش ڈیلائٹ خریدنی تھی۔ ایک دکان پر چائنیز بڑی بی نظر آئیں۔ ان سے مول تول ہو رہا تھا تو برابر کی دکان والے نے ایک ڈالر سستی بتا دی۔ ہم اس طرف ہو لئے۔ دکان میں نمونے کی مٹھائی کھائی اچھی تھی۔ ایک پستے کی ٹرکش روایتی چاکلیٹ تھی وہ بھی خوش ذائقہ تھی۔ چند ڈبے خریدے۔ ایک ہم نے بھی لیا۔ ڈالر میں ادائیگی کر کے نکلے تو دیکھا اِی ڈی غائب ہے۔ ہم اور کلے رہ گئے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ ہم نے تو اس خطرے کا اظہار کیا کہ چائنیز عورت سے خریداری نہیں کی۔ اس لئے ناراض ہو کر چلا گیا۔'' کلے تو اس بات کو سنجیدہ سمجھی۔ ہم نے بتایا۔ از راہِ تفریح کہہ رہے ہیں'' تب وہ مطمئن ہوئی۔

دکانوں میں زیادہ تر ایسی چیزیں نظر آئیں جو یورپ اور امریکہ سے منگائی گئی تھیں بے حد معمولی اور سستی تھیں لیکن یہاں مہنگی فروخت ہو رہی تھیں۔ دکانوں پر ڈالر میں ادائیگی وصول کی جا رہی تھی اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ انگریزی سمجھنے والے لوگ تھے۔

کلے کو ایک دکان پر ریشمی مفلر پسند آیا۔ مہنگا تھا۔ لیکن اگر کوئی چیز اچھی لگے تو قیمت نہیں دیکھی جاتی۔ کلے نے گلے میں ڈال کر آئینہ میں دیکھا تو خوش ہونے لگی۔ ہم سے مشورہ کیا ہم دکاندار اور کلے کو آزردہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے کسی یورپی ملک کا بنا ہوا مفلر کلے کے بیگ میں شامل ہو گیا۔ ہمارے ساتھی سیاح اِدھر اُدھر نظر آتے۔ لیکن وہ خریداری پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس مارکیٹ کے اکثر دکاندار محروم رہے۔

ہم نے گھڑی دیکھ کر کہا ''اب ہمیں واپس چلنا چاہئے.....'' ساری دکانیں ایک سی ہیں..... نہ جانے یہاں سیاحوں کے علاوہ بھی کوئی آتا ہے یا نہیں۔ یہ جگمگاتی سجی سجائی دکانیں ملک ملک کے لوگوں کا انتظار کرتی ہوں گی۔

جب ہم اونچی ہوتی سڑک پر چڑھ رہے تھے تو کلے کو چائے کا ہوٹل نظر آیا۔

''ایک کپ چائے پیتے ہیں.....'' وہ بولی۔

''دیر ہو جائے گی .....'' ہم نے کہا۔

''کپ میں لے کر چلیں گے.....''

ہوٹل میں چائے کپ میں دینے کا انتظام تھا۔ ہم نے خریدی اور پہلے ہی گھونٹ پر احساس ہوا۔ چائے میں چینی نہیں۔ چینی میں چائے ڈالی گئی ہے۔ لیکن ڈالر خرچ ہوئے تھے۔

کلے ایک گھونٹ سے زیادہ نہ پی سکی۔ اور دونوں گلاس ڈسٹ بن میں ڈالنے پڑے۔

کوچ تیار تھی۔ ایک ایک کر کے ساتھی آ رہے تھے۔ کوچ کے پاس مختلف چیزیں بیچنے والے جمع ہو گئے.....ٹوپیاں، مفلر، قالین، رنگین کپڑے، ایسے قالین جو چار تہہ کر کے ہاتھوں میں تھے۔ اگر غلطی سے کوئی اس طرف دیکھ لیتا۔ پھر ان سے صرف مراد ہی جان بچاتا۔ ذرا دیر یہ کھیل رہا۔ جب سب اندر آ کر گئے تب ایک دوسرے کو وہ نوادرات دکھانے لگے جو ان کے خیال میں کوڑیوں کے مول خریدے ہوں۔

مراد مسکرا رہا تھا..... استنبول کی معیشت کا پہیہ چلا کر اور اسی وقت کوچ کے پہیے چل پڑے نئی منزل کی طرف۔

آخری دن

استنبول میں آج آخری دن ہے۔

رات سے بارش ہو رہی ہے۔ صبح کے ساڑھے سات بجے ہیں۔ ہمارے ساتھی ڈائننگ ہال میں ناشتے کے لئے آئے ہیں۔ ہر میز کے گرد تر و تازہ چہروں والے لوگ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔

ہمارے ساتھ ای ڈی، کلے اور صالح شیخ بیٹھے ہیں۔

صالح شیخ کرسی سے اٹھا اور اپنے لئے فروٹ سلاد لے آیا۔ ای ڈی نے ایک بار پھر ابلا ہوا انڈا لیا ہے۔

''آپ کافی اور لیں گے'' .... کلے نے پوچھا۔

''نہیں شکریہ....''

ای ڈی چپ چاپ ناشتہ کر رہا ہے۔ صالح شیخ تفصیل سے استنبول سے مصر جانے اور پھر کینیڈا واپس آنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔

''آپ آسٹریلیا آئیں.....'' کلے نے ہم سے کہا۔

''ضرور آئیں گے.....''

الی شا بے حد خوش ہے۔ ہر میز پر جا کر ہاتھ ملاتی ہے۔ ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی اس نے کاغذ دیا۔

''یہ کیا ہے''..... صالح شیخ نے پوچھا۔

''سب لوگوں کے پتے ہیں...'' وہ بولی۔

''گڈ آئیڈیا۔ اب ہم ایک دوسرے سے رابطہ رکھ سکتے ہیں...'' وہ بولا

ایک کاغذ ہمیں بھی ملا۔

''آپ مجھے خط ضرور لکھیے گا۔ میرا مطلب ہے ای میل..... وہ ہم چاروں سے کہہ رہی تھی۔

''وعدہ... '' وہ ہاتھ ملانے لگی۔

ہمارے تینوں ساتھیوں نے گرم جوشی سے خط لکھنے کا وعدہ کیا۔

ہم چپ رہے۔ ایسے کتنے ہی پتے۔ ہر سفر کے آخری دن ملتے ہیں اور پھر دوسرے کاغذوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ہم سینکڑوں لوگوں سے ملے ہیں۔ ان کے کارڈ، فونو، ٹیلی فون نمبر اور پتے لئے ہیں۔ پھر وہ سب اِدھر اُدھر ہو گئے۔

جو بچھڑ جاتے ہیں۔ کبھی نہیں ملتے۔ دنیا بڑی مختصر ہے۔ لیکن اس میں گھنے جنگل، اونچے پہاڑ اور طویل سمندر ہیں۔ یہ درمیان میں حائل ہو جائیں تو انسان کبھی نہیں ملتا۔

آج جو چہرے ہمارے سامنے ہیں۔ یہ آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ پھر دوبارہ نہیں ملیں گے۔

کلے نے کہا۔

''آسٹریلیا ضرور آئیں.....''

جیمس نے اصرار کیا۔

''لندن آئیں تو برمنگھم کا دورہ ضرور کریں۔''

صالح شیخ اصرار کر رہا ہے۔

''اس بار کینیڈا آئیں تو مجھے ضرور فون کیجئے گا۔''

رابرٹ ویلس بلا رہا ہے۔

سیلیا نے فلوریڈا آنے کی دعوت دی ہے۔

مراد کہہ رہا ہے .....

''استنبول دوبارہ آئیں۔ آپ نے ابھی اس شہر میں کچھ نہیں دیکھا۔..''

اور ہم سب سے وعدہ کر رہے ہیں۔

ضرور آئیں گے۔

آسٹریلیا دیکھیں گے۔

لندن جائیں گے۔

کینیڈا کا چکر لگائیں گے۔

اس لئے کہ جس رب کے پاس ہماری سانسیں جمع ہیں وہ چاہے تو ان میں اس وقت تک اضافہ کرسکتا ہے جب تک ہم اس کی زمین کا چپہ چپہ نہ گھوم لیں۔ ایک ایک چہرہ نہ دیکھ لیں۔

آج ان مسکراتے۔ تر و تازہ چہروں سے بچھڑنے کا دکھ نہیں ہے۔ کل کسی اور جزیرے، شہر، بستی میں اس سے زیادہ مسکراتے، صحت مند چہرے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

ہمارا ایمان ہے ہمارا خالق، ہمارا پالنے والا ہمیں اپنی ساری دنیا خوشحال اور صحت مند زندگی کے ساتھ دکھائے گا۔

....

ساری دنیا کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن یہ بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں سب سے زیادہ تعداد میں قمر علی عباسی نے سفرنامے لکھے ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں لکھنے والے سفرناموں کی سب سے زیادہ تعداد کے مصنف قمر علی عباسی ہیں۔ گزشتہ دس بارہ برسوں میں انہوں نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔ امریکہ سے ہندوستان تک اور سنگاپور سے لندن تک بہت سے ملک اور شہر ان کی تحریر کی زد میں آئے۔ ان کا ایک بڑا کمال یہ بھی ہے کہ وہ سفرنامے بالارادہ اور بالالتزام لکھتے ہیں یعنی وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت صرف سفرنامے لکھنے کے لئے سفر کرتے ہیں اور بسا اوقات تو سفر کے سارے اخراجات بھی خود برداشت کرتے ہیں۔ اس زودنویسی بالارادہ تحریر کا ملکہ نشریاتی اداروں اور خاص طور سے ریڈیو براڈ کاسٹنگ سے تعلق رکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ممکن ہے ریڈیو کے شعبے سے طویل وابستگی کے سبب ہی انہوں نے یہ وصف حاصل کیا ہو۔

میں نے عباسی کے تقریباً سارے ہی سفرنامے پڑھے ہیں کیونکہ میں خوش قسمتی سے اس فہرست میں شامل ہوں جنہیں وہ اپنی تصنیف ضرور بھیجتے ہیں اور جب ایک بار ان کی کتاب مل جائے اور انسان اسے پڑھنا شروع کر دے تو پھر مکمل کئے بغیر نہیں چھوڑتا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے ان کو دلچسپ اور دلکش نثر لکھنے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ ان کی تحریروں کی شگفتگی اور بے ساختگی بلاشبہ ان کو دور حاضر کے بہت سے مصنفوں سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔

اسلام آباد پاکستان

آغا ناصر